Acc. No. 90

اقبال شناسی اور

ادبائے بلوچستان کی تخلیقات

جملہ حقوق محفوظ

فروری ۱۹۹۰ء

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
بزم اقبال ۔ کلب روڈ

طابع : سید محمد علی انجم رضوی

مطبع : عظیم پرنٹنگ کارپوریشن
۱۰ ۳/۳ غازی روڈ ۔ لاہور کینٹ ۔ لاہور

تعداد : ۵۰۰

صفحات : ۱۹۲ + ۸ = ۲۰۰

قیمت : -/۹۰ روپے

Old: 1189D

A.S. URDU RESEARCH CENTRE, K.V.K. HYD.
A.C.C. No. 96

فہرست

۱ - شروعات		۱
۲ - اقبال اور کوہستانی	پروفیسر انور رومان	٦
۳ - اقبال شناسی اور چند اہم تجاویز	پروفیسر انور رومان	۱۰
۴ - اقبال کا فلسفہ موت	محمد اقبال سلمان	۱٦
۵ - اقبال کا نظریہ تعلیم	بیگم آثم ملک	۲۳
٦ - علامہ اقبال کا نظریہ اجتہاد	پروفیسر انعام الحق کوثر	۲۸
۷ - فکر اقبال کے ماخذ	پروفیسر آغا صادق حسین	۳۳
۸ - اقبال کا مرکزی خیال	پروفیسر آغا صادق حسین	۵۰
۹ - اقبال اور مناظر قدرت	پروفیسر آغا صادق حسین	۵۳
۱۰ - اقبال کی شاعرانہ حیثیتیں	پروفیسر آغا صادق حسین	٦۰
۱۱ - انسان کامل اقبال کی نظر میں	پروفیسر آغا صادق حسین	۷۱
۱۲ - اقبال ایک فن کار کی حیثیت سے	پروفیسر آغا صادق حسین	۷٦
۱۳ - اقبال کا تصور خودی	پروفیسر شمیم احمد	۸۳
۱۴ - عزیز مگسی کی شاعری پر علامہ اقبال کے اثرات	میر مٹھا خاں مری	۹۰
۱۵ - علامہ اقبال اور تحریک پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۱۰۲
۱٦ - یوم اقبال	اقبال ساغر صدیقی	۱۱۲
۱۷ - علامہ اقبال کا ذہنی ارتقاء	مسز ثاقبہ رحیم الدین	۱۱۵
۱۸ - اقبال اور عظمت آدم	ملک محمد رمضان بلوچ	۱۳۳
۱۹ - اقبال کی غزل گوئی	پروفیسر مجتبیٰ حسین	۱۴۰
۲۰ - اقبال اور ملی احیاء	حمید نسیم	۱۴۷
۲۱ - بلوچ ادبی شخصیات اور علامہ اقبال	سر بلند خان	۱۵۳
۲۲ - شمع اور شاعر	امداد نظامی	۱۵۷
۲۳ - اقبال اور خودی	جاوید اقبال	۱٦۴
۲۴ - اقبال اور نظام مملکت	پروفیسر سعید احمد رفیق	۱٦۹
۲۵ - اقبال کے قارئین	پروفیسر مجتبیٰ حسین	۱۸۸

پروفیسر انور رومان کے نام ــــــــ

عرفانی ''فنا فی الاقبال'' ہیں اور اس طرح اقبال کے کلام سے لگاؤ پیدا کرتے ہیں کہ استاد ہوں یا شاگرد سبھی اقبال کے کلام کا اشتیاق سے مطالعہ کرنے لگتے ہیں'' یہ بہت بڑی خوبی ہے۔

خواجہ عبدالحمید عرفانی خود رقمطراز ہیں: ''کوئٹہ میں مقیم چند اہلِ علم و ادب دوستوں (جن میں ملک محمد صادق شاذ، خواجہ مسعود، منشی فضل کریم، سید اکبر حسین رضوی، سید اعجاز حسین رضوی، لطیف جلیلی، تحریک پاکستان کے معروف شاعر بشیر فاروق، نیک محمد عاطفی، بلوچستان کے ''حالی'' اور ''حسان'' صوفی نثار احمد محشر رسول نگری اور دس بارہ برس بعد آنے والے قادر الکلام شاعر سید آغا صادق حسین کے نام قابل ذکر و احترام ہیں) کے تعاون سے ۱۹۳۱ء سے قائم شدہ بزم اقبال، اردو اور فارسی زبان کی خاص طور پر علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کی ترویج اور تبلیغ کی خدمت انجام دیتی رہی۔

بزمِ اقبال کے قیام کے بعد میں نے بہت حد تک شعر کہنا ترک کر دیا اور تاحدِ مقدور اپنے پٹھان اور بلوچ شاگردوں میں اقبال کے اردو اور فارسی کلام کو مقبول بنانے میں کوشاں تھا۔ میرے شاگردوں کے لیے یہ بات خوشگوار حیرت کا موجب ہوئی کہ برصغیر ہند میں سب سے پہلا فارسی ادب کا مرکز خضدار اور سب سے معروف مشاعرہ رابعہ[۲] خضداری تھی۔ اکثر طلباء غزنی، کابل اور لاہور میں فارسی کی مقبولیت سے آشنا تھے اور کوئٹہ اور قلات میں فارسی شعر کہنے والے موجود تھے اور بہت سے طلبا کی مادری زبان فارسی تھی۔ اس لیئے علامہ اقبال کے فارسی کلام اور پیام کو نوجوان طلبا میں بہت جلد مقبولیت حاصل ہونے لگی۔''

۱۔ اقبالِ ایران، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی، سیالکوٹ، ۱۹۸۶ء ص ۱۱، ۱۲

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: بلوچستان میں فارسی شاعری، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، کوئٹہ، ۱۹۶۸ء شعر فارسی در بلوچستان، دکتر انعام الحق کوثر، لاہور، ۱۹۷۵ء، ناشر: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان

بلوچستان میں اقبال شناسی' کی روایت قائم کرنے والے پاکستان کے پہلے پریس اتاشی پھر کلچرل اتاشی جنھوں نے یہ روایت علامہ اقبال کے حوالے سے سرتاسر ایران پہنچائی ، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی ہیں جن پر سرزمین بلوچستان بھی فخر کرتی ہے -

بلوچستان میں سیاسی بیداری کے علمبردار اور مرد مجاہد میر یوسف علی خان عزیز مگسی (۱۹۰۸ء تا ۱۹۳۵ء) علامہ اقبال سے بڑے متاثر تھے - میر محمد امین خان کھوسہ اپنے مضمون "بلوچستان کے اولین انقلابی راہنما" میں لکھتے ہیں :[2]

"اقبال کے کلام میں ایک صحیح آدمی کے صحیح جذبات کے ابھارنے کی پوری طاقت موجود ہے - لیکن شرط یہ ہے کہ آدمی بھی صحیح ہو اور جذبات بھی صحیح ہوں - شکوہ اور جواب شکوہ اور اقبال کی دیگر نظمیں اس نوجوان سردار کی سیاسی راہنما بنیں اور آناً فاناً یہ ناز و نعم میں پلا ہوا نوابزادہ اپنی قوم میں سے جہالت اور مفلسی دور کرنے کے خیال سے بلوچستان کے استبدادی حلقہ پر یلغار کرتا ہے -"

بلوچستان میں اقبال شناسی کی یہ روایت آج بھی جاری و ساری ہے اس کی تفصیلات علامہ اقبال اور بلوچستان از ڈاکٹر انعام الحق کوثر (ناشر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ، سال اشاعت ۱۹۸۶ء صفحات ۲۱۶) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں -

ناگی عبدالرزاق خاور نے اپنے پہلے مجموعہ کلام "عرفان و آگہی" (زیر اہتمام : انجمن دبستان بولان کوئٹہ ، ۱۴۰۶ھ) میں کہا ہے :

---

۱ - پیر غلام دستگیرالقادری ناشاد کے مجموعہ کلام "پیر مغان" پر تبصرہ ، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی ، پیش لفظ ڈاکٹر انعام الحق کوثر ، کوئٹہ ، ۱۹۸۴ء ص ۳

۲ - نصرت ، کراچی ، (عزیز مگسی نمبر) ۵ جون ۱۹۵۷ء

به فیضِ رومی و اقبال خاور
مری فطرت میں ذوقِ شاعرانہ

حال ہی میں ایک کتاب ''اقبالیات کے چند خوشے'' از ڈاکٹر انعام الحق کوثر گیارہ مضامین کا مجموعہ ، ناشر : قریشی پبلی کیشنز ، چوک مشن روڈ کوئٹہ ، صفحات ۲۳۷ ، ۱۹۸۸ء) علامہ اقبال کی سن وفات کو مدنظر رکھتے ہوئے نصف صدی گزرنے پر منظر عام پر آئی ہے -

مختصراً بلوچستان بھر میں مختلف سطحوں پر افکارِ اقبال کو عام کیا جا رہا ہے - علامہ اقبال سے متعلق مضامین کا موجودہ انتخاب ، جسے بزم اقبال ، لاہور زیورِ طباعت سے آراستہ کر رہی ہے ، اس کا منہ بولتا ثبوت ہے -

اللہ تعالیٰ کا ان گنت شکر ہے کہ اس نے اس ناچیز کو ہمیشہ کی طرح امنگ ، حرارت اور امید سے نوازا اور میں اس کام کو مکمل کرسکا :

مری زندگی ، مری بندگی ، تری کائنات کی دھول ہے
یہ کرم ہے ، حسن قبول ہے کہ بنا دیا مجھے کیا سے کیا

میں محترم ڈاکٹر وحید قریشی کا دل کی پہنائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں جو اس ہیچ مداں سے کسی علمی و ادبی کاوش کو پایۂ تکمیل تک پہنچوا کر ہی دم لیتے ہیں اور یوں تھپکتے نظر آتے ہیں :

بہت قریب ہیں منزل کی خوشبوئیں عمران
کچھ اور دیر چراغ ہاتھ پر اٹھائے رکھو

اس بیکراں لمحے ، میں مجھے اپنے ان بزرگوں اور استادوں جنہوں نے اس ناچیز کی تعلیم و تربیت میں بھرپور حصہ لیا ، کی دلی دعائیں یاد آ رہی ہیں -

واقعتاً یہ امر خوش بختی اور سر بلندی کا باعث ہے کہ محترمہ والدہ صاحبہ عالم دل شکستگی میں مجھ ناچیز اور میرے اہل خانہ کو دعاؤں سے نوازتی ہیں :

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں !

مجھے جناب محمود رشی ، جناب اصغر حسن ، عزیزی محمد فہیم الحق، عزیزی محمد ساجد کوثر ، عزیزی محمد شاہد کوثر ، عزیزہ فہمیدہ کوثر ، مسٹر اختر محمد اور مسٹر سہیل اکبر کا خصوصی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے مختلف مراحل میں میری اعانت کی ۔

آخر میں سلیم گیلانی کے الفاظ میں بارگاہِ خداوندی میں دست بدعا ہوں :

ہے نفس نفس تری آرزو ، ہے قدم قدم تری جستجو
ترے ذکر سے مری آبرو ، تری فکر سے ہے مری جلا
مرے روز و شب کو نبی ؐ کے اسوہ کاملہ کا مطیع کر
ہے یہی سبیل کہ مٹ سکے مرے قول و فعل کا فاصلہ

انعام الحق کوثر

جناح روڈ ، کوئٹہ
۲ جمادی الاول ۱۴۰۹ھ
۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ء

پروفیسر انور رومان

اقبال اور کوہستانی

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جغرافیائی ماحول انسانی خورد و نوش، بود و باش اور فکر و تصور پر بہت اثر ڈالتا ہے۔ اسی حقیقت کے متعلق مانٹسکیو نے ایک جگہ لکھا ہے "زیادہ گرمی انسانوں کی ہمت اور طاقت کو کمزور کر دیتی ہے، گرم علاقوں میں رہنے والے اکثر غلام ہوتے ہیں لیکن سرد آب و ہوا میں پھلنے پھولنے والے انسان ہمیشہ اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہیں" اور مشہور جرمن شاعر شلر نے لکھا ہے "آزادی پہاڑوں میں مقیم ہے۔" اسی طرح اور ان دونوں اکابر سے پہلے موجودہ ساجیات کا بانی مشہور عرب تاریخ دان اور فلسفی ابن خلدون اس جغرافیائی جبریت کا قائل تھا اور اس نے مصریوں وغیرہ کے حالات زندگی اُن کے جغرافیہ کی روشنی میں بے نقاب کیے ہیں۔

علامہ اقبال بھی اس جغرافیائی حقیقت کو تسلیم کرتے تھے اور اسی لیے انہوں نے اپنے موضوعات میں کوہستانیوں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ جب کبھی انہوں نے دورِ نو کے ترکیبی اسباب پر غور کیا تو سب سے زیادہ جہادی لاوا اہلِ کوہ میں ہی محسوس کیا اور انہیں بار بار بیداری کا پیغام دیا۔

بانگ درا کی پہلی نظم ہمالہ ہے ان کے لیے ہمالہ محض ایک پہاڑ نہیں تھا بلکہ وہ ایک ٹھوس مظاہرہ تھا تحفظ، رفعتِ لازوال، آزادیٔ فطرت، حسنِ مناظر اور ذوقِ فکر و نظر کا۔ لیکن وہ ہمالہ کو انسانیت کے لیے

ایک اکمل نمونہ بنا کر پیش نہیں کر رہے تھے مثلاً انہوں نے طلبہ علیگڑھ کالج کے نام پیغام میں کہا ہے :

آتی ہے کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکون

انہیں پہاڑ کا یہ سکون اور جمود پسند نہیں تھا ۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علامہ اقبال جغرافیائی یا تاریخی یا اقتصادی یا نسلی غرضیکہ کسی قسم کی جبریت کے قائل نہیں تھے وہ انسان کی قوت تخلیق کو ماحول سے زیادہ فیصلہ کن سمجھتے تھے یعنی آن کے خیال میں انسان میں اتنی فطری صلاحیت موجود ہے جو ماحول کے برے اثرات کو زورِ خیالات اور جذبہٗ انقلاب سے دور کر سکتی ہے ۔

علامہ اقبال کا نظریہ یہ تھا کہ پہاڑوں میں پروان چڑھنے والے انسان طاقتور اور پر جلال ہوتے ہیں ۔ ان کی زمینی بلندی یقیناً آن میں کچھ ایسی خصوصیات پیدا کر دیتی ہے جو میدانوں کو حاصل نہیں ہیں مثلاً وہ فطرت کے زیادہ قریب ہیں اس لیے ان کی زندگی فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے اور اسی لیے علامہ اقبال کہتے ہیں ۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

لیکن ان کے خیال میں کوہستانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت آن کی آزادی پسندی ہے ۔ خوشحال خاں اپنے مرقد کے متعلق وصیت کرتا ہے:

اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شاہسواروں کی گردِ سمند

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ علامہ اقبال کو کوہستانیوں کے نظامِ حیات پر کوئی اعتراض نہیں ۔ انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ کوہستانی امتیاز قبائل میں کھوئے ہوئے ہیں :

ہزار پارہ ہے کہسار کی مسلمانی
کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زناری

پروفیسر انور رومان

اقبال شناسی اور چند اہم تجاویز

موجودہ زمانے میں جب کہ انسان لاشعور کی دریافت سے ہول دلی کا شکار ہو رہے ہیں خیالات انسان کو بچانے کے لیے اور بھی ضروری ہو گئے ہیں۔

لیکن ان خیالات کے خالق انسان ہیں اور اس لیے ہمیں یہ تلاش کرنا ہوگا کہ وہ کون سی شخصیت تھی جس نے ہماری ذہنی عنان کو پاکستان کی طرف موڑا جس نے سب سے پہلے یہ خواب دیکھا، جس نے اس انقلاب کے لیے ہمارے ذہنوں کی ضروری تربیت کی، جس نے اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا اور اس کی تشکیل کے لیے اشاراتی مینار روشن کیے، الغرض وہ کون سی ہستی ہے جو اس انقلاب کی ذہنی و خیالاتی بنیاد ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس انقلاب کے حاملین کو سرگرم رکھے گی اور ان کا محاسبہ کرنے کے علاوہ انہیں وقت کے مطابق نئے نئے خیالاتی اوزار مہیا کرتی رہے گی؟

یہ عظیم شخصیت علامہ اقبال ہیں جس کے تصورات کا مرئی ظہور پاکستان ہے اور جن کے بغیر پاکستان محض ایک ہوائی پیکر ہے وہ بجا طور پر پاکستان کی ٹھوس ترین بنیاد ہیں اور ان کے بغیر پاکستان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

پاکستان کی اس ذہنی و فکری حقیقت کو جتنا جلد ہی سمجھ لیا جائے اتنا ہی اچھا ہے اور جتنی گہرائی سے سمجھا جائے اتنا ہی کم ہے اور پاکستانی ادب کا اہم ترین اور افضل ترین فرض اسی بنیادی حقیقت کو اجاگر کرنا ہے۔

اب تک اس سلسلے میں جو کچھ کیا گیا ہے وہ سمندر میں قطرے کی حیثیت رکھتا ہے میرے اس فقرے پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ عالم میں تقلیدی اور تخریبی مفکر جتنے زیادہ ہیں تخلیقی اور تعمیری مفکر اتنے ہی کم ہیں اور اسی لیے بار بار انقلابوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

اقبال ایک ایسے ہی تخلیقی و تعمیری مفکر ہیں۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت پر جتنا بھی لکھا جائے اتنا ہی کم ہے کیونکہ زندگی کی معمولی سے معمولی حقیقت سے لے کر بلند سے بلند فلسفے تک انہوں نے رائے زنی کی ہے۔ مزدور سے لے کر خدا تک انہوں نے اپنے خیالات کو منسلک کیا ہے، ہماری سماجی زندگی کے ہر پردے کو چاک کیا ہے۔ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کماحقہ روشنی ڈالی ہے، عروجی و زوالی کیفیتوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔

فنون لطیفہ کے مقامات پر ہنگامہ خیز تنقید کی ہے اور موجودہ زندگی اور مستقبل کے لیے ہمیں ایک صالح ترین معیار بخشا ہے اور اس سب کچھ کا پس منظر خالص اسلامی تاریخ ہے۔ ہماری یہ انتہائی بدقسمتی اور بے حمیتی ہو گی اگر ہم ان کے ہوتے ہوئے دوسروں کے پاس دریوزہ گری کرتے پھریں۔ وہ بلا شک و شبہ دنیا کے ان معدودے چند مفکرین میں سے ہیں جو انقلاب خیز بھی ہوتے ہیں۔ اور انقلاب زندہ دار بھی۔

ممکن ہے ہم اپنی موشگافیوں کی وجہ سے مخمصے میں اُلجھے رہیں کہ وہ شاعر ہیں یا فلسفی، حکیم ہیں یا نقاد؟ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ یہ سب کچھ ہیں لیکن سب سے زیادہ وہ پاکستان کے ذہنی جنم داتا ہیں ان کے ہاں لطیف ترین منظر کشی اور حساس ترین نیچرل شاعری ہے۔ ان کے ہاں ڈانٹے کا آسمان گیر تصور ہے۔ گوئٹے کا ابدی اخلاق ضمیر ہے اور ملٹن کی طرح ہبوط آدم اور صعود آدم کا ادراک ہے لیکن ان سب سے زیادہ وہ آپ کو، اسے اور مجھے کہیں بلا رہے ہیں، کہیں کھینچ رہے ہیں، کہیں لے جا رہے ہیں — وہ کہیں یہی پاکستان ہے، صبح کے مقدس لمحات میں بیٹھ کر کبھی ان کی آواز کو تو سنیے، دن

کے ہوشربا ہنگاموں میں ان کی صداؤں پر تو کان دھریے ، سکوت شام میں ان کے معنی خیز اشارات کو تو سمجھئے ، اندھیری رات کے عالم میں اس روشنی کو تو دیکھئے جو وہ جلا رہے ہیں ! انہوں نے ہر مقام سے ہمیں بلایا ہے - حجاز ، اندلس اور سسلی ، لندن ، بھوپال ، مدراس ، طہران اور کابل — ہر جگہ سے ہمیں پکارا ہے - انہوں نے کارخانوں ، کھیتوں ، مسجدوں ، گھروں ، محلوں ، جھونپڑیوں ، سکولوں ، کالجوں ، خانقاہوں اور خرمنوں ہر جگہ سے ہمیں آوازیں دی ہیں انہوں نے ہم میں سے ہر ایک کو پکارا ہے - کسانوں ، مزدوروں ، زمینداروں ، بچوں ، بوڑھوں ، عورتوں ، پیروں ، مریدوں ، طالب علموں اور استادوں ، ہر ایک کو پکارا ہے ، بانگ درا ، بال جبریل ، ضرب کلیم ، ارمغان حجاز . یہ سب کیا ہیں ؟ کیا یہ محض الفاظ ہیں ؟ نہیں یہ وہ پیغامات ہیں جو انہوں نے ہمیں دیے ہیں ، روشنی کے وہ مینار ہیں جو انہوں نے نصب کیے ہیں - اسرار خودی ، زبور عجم ، پیام مشرق ، جاوید نامہ کیا یہ محض الفاظ ہیں ؟ نہیں یہ ہمیں ایک وسیع تر دنیا میں لے جاتے ہیں ، ہماری بین الاقوامیت کے مظہر ہیں -

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ، ناقۂ بے زمام را

جب علامہ اقبال نے یہ لکھا تھا کہ 'من نوائے شاعر فرداستم' تو یہ شاعرانہ تعلی نہیں تھی - یہ وہ حقیقت ہے جسے ہمیں سمجھنا ہے - یہ کہنا غلط ہے کہ ہم ان کے متعلق بہت کچھ کر چکے ہیں ایسا نہ ہوا ہے اور نہ ممکن تھا اگر ہم انہیں سمجھ چکے ہوتے تو ہمارے ماہناموں ، مباحثوں ، اخباروں اور مذاکروں میں ان کے خیالات کے سوا باقی دنیا کے دوسرے مفکروں کے خیالات چھائے ہوئے نہ ہوتے -

ان کو سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا بالترتیب مکمل اور عمیق مطالعہ کیا جائے میں یہاں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ انگریز قوم شیکسپیئر کو پچھلے چار سو سال سے پڑھ رہی ہے ۔ چار سو سال سے اور خود آپ بھی اس کا سوا سو سال سے مطالعہ کر رہے ہیں - یونیورسٹیوں ،

اکاڈمیوں اور بالائی طبقوں کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ۔ آپ رائے عامہ کے خالق و نباض ہیں اور ضمیر ملیہ کے حامل ، اس لیے یہ فرض آپ پر عائد ہوتا ہے ۔

اقبال شناسی کے اس کام کے لیے ایک باقاعدہ پلان کی ضرورت ہے جس کی نوعیت کچھ ایسی ہو سکتی ہے :

۱ - چونکہ علامہ اقبال کا پیغام شاعری میں ہے اور ان کے مطالب گہرے ہیں اس لیے اقبال شناسی کا اہم ترین قدم یہ ہونا چاہئے کہ انہیں واضح کیا جائے ۔ ان کے استعارات و تشبیہات اور اشارات و کنایات کی تشریح ہو اور سلیس انداز میں ان کے پیغام کو سمجھایا جائے ۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ جب تک علامہ اقبال ، حافظ اور شیکسپئر کی طرح ہمارے عوامی ذہن میں جاگزیں نہیں ہو جاتے اس وقت تک ہمارے عوام اچھے یا برے فلسفے کا شکار ہوتے رہیں گے اقبال شناسی کے اس پہلو کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی اس لیے سب سے بڑی ضرورت تشریحی اور عوامی ہے ۔

۲ - اقبال جامیت کے لحاظ سے ایک انسائیکلوپیڈیا ہیں اس لئے دوسرا ضروری قدم علمی و تحقیقی ہے ان کے سیاسی ، سماجی ، معاشی ، انقلابی ، فنی ، اخلاق ، انفرادی ، اجتماعی ، سائنسی وغیرہ نظریات کا مطالعہ کیا جائے ۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بعض اوقات تو ان کے الفاظ براہ راست ان کے مطالب کے آئینہ دار ہیں لیکن بعض اوقات ان الفاظ پر تنقیدی رنگ اتنا شوخ ہوتا ہے کہ وہ اس موضوع کی محض تنقیص معلوم ہوتے ہیں جس کی علامہ نے ترجمانی کی ہے مثلاً وہ مشینوں کی مخالفت کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔

احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

سے بعض قارئین یہ مطلب لیتے ہیں کہ وہ سائنسی ایجادات کے مخالف ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔ وہ دوسری جگہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوق انقلاب
ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب!
ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی
ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب!

اس لیے درون پردہ مطالب کو بہت حد تک داخلی شہادت سے واضح کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ ان کی جامعیت میں ایک اشتراک اور ان کی کثرت میں ایک وحدت ہے ان کے محقق کو ان کے اس اشتراکی و وحدتی پہلو کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا ہوگا۔ مختصر طور پر اس کا مطلب ان کی انفرادیت اور ماضی اسلام کا پس منظر ہے۔ اس کا بھی خیال رکھنا ہے کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے عالمگیر ہیں ڈانٹے یا ملٹن یا گوئٹے کی طرح۔ لیکن ان میں اور اقبال میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ڈانٹے نے پروٹسٹنٹ رد عمل کے پیش نظر رومن کیتھولک نظام فکر کے حسن کو اجاگر کیا۔ ملٹن نے بادشاہت کی دوبارہ فتح پر (جو پیوری ٹن پابندیوں کے برعکس ایک ہمہ سوز آزادی تھی) پیوری ٹن انقلاب کے فکری پہلوؤں کو روشن کیا، گوئٹے نے مادیت کے خلاف روح اور اس کی تسکین پرور کائنات کو نمایاں کیا۔ لیکن یہ سب کسی ضائع شدہ یا زوال پذیر چیز کو محفوظ کر رہے تھے۔ اس کے برعکس علامہ شوکت اسلام کو محفوظ کرتے ہوئے اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کا لہجہ شروع سے آخر تک انقلابی ہے، ہنگامہ خیز اور جدت انگیز! وہ محفوظ کرنے سے کہیں بڑھ کر مسلمانوں کی روح انقلاب کو جگا رہے ہیں اور عملی طور پر اس میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔

۳۔ اقبال شناسوں کا تیسرا اہم قدم تنقیدی ہے جہاں علامہ مرحوم و مغفور کے نظریات کا محاکمہ کرنا ہے۔ صحیح محاکمے کا

ضروری ترین نکتہ یہ ہے کہ پہلے ڈاکٹر اقبال کو پڑھا جائے اور پھر دوسرے مفکرین کو ، نہ کہ ہمارے موجودہ طریقے کے مطابق کہ پہلے دوسروں کو پڑھ کر ڈاکٹر اقبال کا مطالعہ کیا جائے ، اس سے اقبالیت کی روح مسخ ہو کر رہ جاتی ہے اور خود نقاد بھی الجھ کر رہ جاتا ہے اور علامہ میں ایک تضاد پاتا ہے ۔

میں اس پر مصر نہیں ہوں کہ اقبال شناسی کی ترتیب یہی رہے تشریحی قدم کے ساتھ ساتھ دوسرے قدم بھی اٹھائے جاسکتے ہیں لیکن میں نے جہاں تک سوچا ہے ، اقبالیت کے یہ تینوں پہلو بہت ہی ضروری اور اہم ہیں ۔

• اقتباس از پاکستانی ادب اور اس کی ذمہ داریاں، پروفیسر انور رومان، ماہنامہ ، مخزن ، لاہور ، جولائی ، اگست ۱۹۴۹ء سالنامہ " تعمیر ، کوئٹہ ، نومبر ۱۹۸۴ء ص ۳۷ تا ۴۰

نوعیت البتہ مختلف ہو گی ، جسے موجودہ دنیوی زندگی کے اچھے برے اعمال کا حاصل سمجھنا چاہیے۔

اقبال بھی موت کو انسانی زندگی کا انجام قرار نہیں دیتا۔ وہ انسان کی زندگی کو لافانی سمجھ کر ، اپنے اس نظریے کے حق میں نہایت مؤثر ، حکیمانہ اور فلسفیانہ دلائل پیش کرتا ہے۔ وہ زندگی کو قدرت کی نہایت محبوب متاع اور اس کی حفاظت کو اس کے مقاصد میں شمار کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے جو مثالیں دی ہیں ، ان سے وہ یہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ موت کی تخریب دراصل ایک نئی تعمیر کا پیش خیمہ ہے :

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں\
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو ، یہ وہ گوہر نہیں

اس دعوے کے حق میں وہ پہلی دلیل یہ دیتا ہے کہ زندگی کا تحفظ ہر چیز کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے ، اس کے علاوہ کائنات کی پہنائیوں میں زندگی اس قدر عام ہے کہ موت اسے مٹانے پر قادر ہی نہیں یا دوسرے لفظوں میں قدرت کا یہ منشا ہی نہیں کہ اسے مٹا ڈالا جائے ، موت تو محض ایک نیند ہے ، اور جس طرح نیند زندگی میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتی ، اسی طرح اجل بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی :

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے\
ذوقِ حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے\
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات\
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظام کائنات\
ہے اگر ارزاں تو سمجھو اجل کچھ بھی نہیں\
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آگے چل کر شاعر یہ ثابت کرتا ہے کہ قدرت کا ہر تخریبی عمل اس کی قوت تعمیر کی دلیل ہے۔ وہ پانی کی سطح ہر موج و حباب کی شکست و ریخت اور ان کے دوبارہ ظہور کی مثال دیتا ہے :

آہ غافل ! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے
جنت نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ
اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر ؟
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر !

اس کے پاس دلائل کی کمی نہیں - وہ ستاروں کی مثال پیش کرتا ہے ان کی عمر کی طرف توجہ دلاتا ہے :

عقل جس سے سربزانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگزشت نوع انساں ایک ساعت ان کی ہے

مگر ستاروں کا انساں سے کیا مقابلہ ؟ انسان جس کے سامنے ملائکہ تک کو سر بسجود ہونا پڑا ، جسے تسخیر ارض و سما کے لیے پیدا کیا گیا اور جو اقبال کے لفظوں میں "محفل قدرت" میں "شمع روشن" کی سی حثیت رکھتا ہے - وہ نابود ہونے کے لیے پیدا کیا گیا ہے ؟ ہرگز نہیں -

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا ؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا ؟

وہ ایک اور دلیل دیتا ہے اور یہ دلیل ایسی ہے ، جو تخم گل کے مرقد اور مرنے کے بعد انسان کی تربت میں مشابہت دکھا کر ہمیں نظری اور جذباتی لحاظ سے اپنی نشاۃ آخری کے تسلیم کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے - اقبال کہتا ہے :

تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بے تاب ہے

دنیا سے رخصت ہونے سے کچھ وقت پہلے اقبال نے اپنے ایک شعر میں بندۂ مومن کی جو نشانی بتائی، وہ اس قابل ہے کہ ہم اسے حرز جان بنائیں :

نشان مردِ مومن با تو می گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

(ماہنامہ 'کوہسار' کوئٹہ، جنوری، فروری ۱۹۵۲ء، ص ۳۶ تا ۳۹)

* * *

بیگم انجم ملک

اقبال کا نظریۂ تعلیم

علم کے معنی کسی چیز کے جاننے کے ہیں۔ کلام پاک میں تعلیم پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے کہ علم گہوارہ سے گور تک حاصل کرنا چاہیے۔ رسول مقبولؐ نے فرمایا ہے کہ اگر چین میں بھی علم ہو تو اس کو حاصل کرنے جاؤ۔ جب کفار پر فتح حاصل کی ہے تو قریش سے فرمایا، یا تو جزیہ دو یا اپنے ذمے ان لوگوں کو لو جو جاہل ہیں۔ اور انہیں تعلیم دو۔ تعلیم کی فضیلت اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں اس کافر کا بھی شکر گذار ہوں جس نے مجھے ایک نکتہ بھی بتایا ہے۔ رسول اللہؐ نے تعلیم پر بڑا زور دیا ہے۔ انسان میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ایسی صلاحیتیں پیدا کی جائیں جس سے دماغی، جسمانی اور روحانی ترقی ہو سکے۔ آدمی نہ صرف انفرادی طور پر بلکہ جماعت میں رہ کر ترقی حاصل کرے۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ اجتماعی حیثیت سے تعلیم حاصل کر کے معاشرہ کا ایک کارآمد فرد بن سکے۔ ڈاکٹر اقبال نے اسلام کے تعلیمی عقیدے کو پیشِ نظر رکھ کر تعلیم کے نظریے کو پیش کیا ہے۔ خودی کے فلسفے کی بنیاد پر ان کی تعلیم کا فلسفہ ہے۔ تعلیم انسانی خودی کو بلند کرنے میں مدد دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کل کی تعلیم کرم کتابی تو بنا دیتی ہے لیکن خودی کو مستحکم کرنے میں کسی طرح مدد نہیں کرتی۔ اس لیے تو وہ طالب علم سے کہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

وہ اس تعلیم کے قائل ہیں جس میں حوصلہ اور جوانمردی پیدا ہو ۔ ایسی تعلیم جس سے آدمی حیات کو تسخیر کر سکے جو بندے کو مولا صفات بنا دے جو علاوہ خدا کے کسی کے سامنے نہ جھکے :

عشق را آتش زن و اندیشہ کن
روبہ' حق باش و شیرے پیشہ کن

وہ نوجوانوں سے کہتے ہیں :

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

وہ ایسی تعلیم کے قائل ہیں جو ہمیں کسبِ حلال پیدا کرنے کی ترغیب دے ۔ جو ہماری صلاحیتوں کو اجاگر کرے ۔ جو ہماری شخصیت بنانے میں ممد ثابت ہو ۔ وہ تقلید کے قائل نہیں ۔ وہ کہتے ہیں :

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

ان کے نزدیک تعلیمی خامی سے ہماری صلاحیتیں اور صلاحیتوں کی کمی سے خودی کو نقصان پہنچ سکتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ وہ زمانہ ہے کہ انفرادی تعلیم کے علاوہ اجتماعی تعلیم بھی بہت ضروری ہے اور یہ صرف اس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم انفرادی طور پر مکمل تعلیم حاصل کریں ۔ کیونکہ :

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہر او را کمالِ ملت است !

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است

اقبال عورت کو تعلیم دینے کے اتنے ہی قائل ہیں جس طرح مردوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں - لیکن وہ بھی اکبر الہ آبادی کی طرح قائل ہیں کہ وہ خاتونِ خانہ بنے ، شمع انجمن نہ بنے - اقبال کہتے ہیں کہ عورت کا سب سے بڑا زیور انسائیت ہے - اگر تعلیم اسے ختم کر دے تو وہ تعلیم نامکمل ہے - سنیے وہ کیا کہتے ہیں :

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ اموبت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہٗ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

غرضیکہ اقبال کا نظریہٗ تعلیم اُن کے نظریہٗ خودی کی بنیاد ہے -

* * *

اجتہاد کے لغوی معنی ہیں کوشش کرنا ۔ لیکن فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لیے کی جائے ۔ اس کی وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے ۔ روایت ہے کہ حضور پاک سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کا عامل مقرر کیا تو فرمایا ، معاملات کا فیصلہ کیسے کرو گے ؟ انہوں نے کہا ''کتاب اللہ کے مطابق ، لیکن اگر وہاں رہنمائی نہ مل سکے تو کیا کرو گے ؟ پھر اللہ کے رسول ؐ کی سنت پر عمل کروں گا ۔ اگر سنت رسول ؐ بھی ناکافی ٹھہری تو ؟ اس پر حضرت معاذ نے جواب دیا تو پھر میں خود ہی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش نہیں کروں گا ۔''

ڈاکٹر اقبال کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مذہبی امور میں تحقیق و تدقیق اور فکر و نظر کا دروازہ بند نہیں ہوا کیونکہ اسلام خاتم الادیان ہے۔ اس لیے منطقی اعتبار سے بھی ضروری ہے کہ تحقیق کے دروازے وا رہیں اور پھر ہمیں اپنے موقف کو سمجھنا چاہیے جس کے تحت اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے ۔ اس لیے ہمیں اپنی حیات اجتماعیہ کی جدید تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کرنی چاہیے تاکہ اس کا وہ مقصد (گویا روحانی جمہوریت کا نشوونما) جو ابھی تک جزوی طور پر ہمارے سامنے آیا ہے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے ۔

اس کے پہلو بہ پہلو یہ بھی ضروری ہے کہ ''کم سواد و کم نظر'' حضرات اس میدان میں رائے زنی کا راستہ اختیار نہ رکھیں، وہ دین میں بدعات کا دروازہ نہ کھولنا چاہتے تھے اور ہمیشہ کتاب و سنت کی پیروی لازمی قرار دیتے تھے ۔ ہاں وہ کورانہ تقلید سے اجتناب برتنے کا مشورہ ضرور دیتے تھے ۔ علاوہ ازیں وہ آزادی کی تحریک کو اسلام کا نازک ترین لمحہ سمجھتے تھے کیونکہ آزاد خیالی کا رجحان عام طور پر تفرقہ اور انتشار کی جانب ہوتا ہے :

اس قوم کی ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

لہذا نسلیت اور قومیت کے یہی تصورات جو اس وقت دنیائے اسلام میں کارفرما ہیں اس وسیع نقطۂ نظر کی نفی بھی کر سکتے ہیں جس کی اسلام نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے۔

علامہ کے خیال کے مطابق ہمیں قرآن مجید کا مطالعہ بحیثیت ایک کتاب کے کرنا چاہیے۔ یہ نظریہ ٹھیک نہیں کہ پہلے سے قائم ہونے والے تصورات کو لے کر اس سے اپنے ارادوں کی تائید تلاش کریں۔ بلکہ ہمیں علم ہونا چاہیے کہ وہ کیا دستور حیات تھا جو حضور پاک سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے برگزیدہ ہاتھوں سے پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ جس کے نتیجہ میں صدیوں کے انحطاط اور قسم قسم کی بدعتوں اور فتنوں کے باوجود اس کی اصلی حقیقت اہلِ نظر سے پوشیدہ نہ رہی اور دنیائے اسلام ایسی ہستیوں سے بھر رہی جن کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا کہ وہ عملی طور پر اس کی ترجمانی اور بقا کے لیے تگ و دو کریں۔ اسی لیے علامہ مسلمان کے لیے محض کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں سمجھتے بلکہ کلمہ کے ساتھ ساتھ اعلائے کلمۃ الحق بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اس نظریہ کے مخالف ہیں کہ خدا خودی کو مٹانے اور فنا کردینے سے ملتا ہے اس خیال کا سوتہ ہندوؤں کے ساتھ روابط اور ملاپ ہی ہے۔ جس کی بنا اکبر نے رکھی اور دارا شکوہ سے اسے تقویت پہنچی۔ جس کے نتیجہ میں مسلمان اپنے آپ کو ذلیل و خوار سمجھنے لگا۔ علامہ نے فرمایا کہ انسان کا مقصد حیات یہ نہیں کہ وہ اپنی خودی کو مٹا دے بلکہ وہ تو 'خلیفۃ اللہ' ہے اور انسانیت کا مقام اتنا ارفع اور بلند ہے کہ:

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی

متاع بے بہا ہے سوز و سازِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اقبال اس خیال کی نفی کرتے ہیں کہ عقل ہی کے طفیل اس وسیع کرۂ ارض کے تمام رموز حل ہو سکتے ہیں اور خداوند تعالیٰ تک رسائی

ہو سکتی ہے۔ انسان کے پاس دو طاقتیں ہیں یعنی عقل اور دل۔ عقل شعور ہے۔ احساس قوت امتیاز اور دل آماجگاہِ عشق۔ علامہ عشق کے اس لیے زیادہ حامی ہیں کہ عقل بسا اوقات گمراہ ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہے اور اشیا کی خارجیت میں الجھ جاتی ہے لیکن عشق کا ہدف ہمیشہ حسن ازل ہے:

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں

قصہ مختصر اجتہاد ایک فقہی (قانونی) اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس اصول کا تعلق صرف قانون یعنی زندگی کے ایک مخصوص پہلو سے ہے حالانکہ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو عملی طور پر ہر نظام حیات ایک قانونی امر ہے کیونکہ علاوہ ہر قوم کی ہستی اور بقا کا راز اس کوشش میں پوشیدہ ہے کہ اس کا ایمان و یقین اس سے جس طرح کی زندگی کا تقاضا کرتا ہے وہ انفرادی اور اجتماعی ہر لحاظ سے اپنے آپ کو اس کے مطابق تبدیل کرتی رہے یعنی اجتہاد کا تعلق ہماری اپنی تبدیلی، ذات از روئے اسلام اور کردار کی مسلسل تعمیر و تشکیل سے ہے۔

اجتہاد کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں اس ترکیب یا ہیئت ترکیبی میں جس کا وہ خود بھی جزو ہے کسی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ بلکہ علامہ اقبال کے نزدیک اجتہاد سے مقصود ہے ہر زندگی کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالتے رہنا:

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامان اوست
بحر و بر در گوشۂ امکان اوست

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

پروفیسر آغا صادق حسین

فکر اقبال کے ماخذ[1]

حقائق اور معارف کی دنیائے نو میں اقبال آدم نو کی حیثیت رکھتا ہے - وہ ایک نیا انسان ہے جس نے نئی دنیا کی بنیاد رکھی - اقبال اب صرف ایک نام ہی نہیں بلکہ ایک مستقل ادارہ ، ایک منظم سلسلہ خیال ، ایک مخصوص طرزِ فکر ، زندگی کی ایک بین تعبیر - اسلام کی واضح تفسیر اور ملت اسلامیہ کا ایک جاذب نقطہ نظر بن چکا ہے اقبال فطرت کا نباض ہے ، زندگی کا مبصر ہے - اسلامی نظام حیات کا شارح ہے اور نہ صرف قرنِ حاضر کا بلکہ تمام ادوار کا مفکر اعظم ہے - اقبال ایک ایسا شاعر ہے جس نے حیات کے بحر بے پایاں میں غوطہ زن ہو کر ابدی صداقتوں کے جواہر ریزے نکالے - جس نے زندگی کے ساز پر انسان کے روشن مستقبل کے وجد انگیز راگ چھیڑے - جس نے انسان کی لاانتہا صلاحیتوں کا جائزہ لیا - جس کے ناخنِ فکر نے بے پناہ امکانات کی گتھیاں سلجھائیں - جس کے وجدان نے خیر و شر کو صحیح معیار بخشا - جس کی نگاہ پردہ در نے دانش حاضر کی کوتاہیوں کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا - - جس نے مشرق و مغرب کی سیاست گمراہ کو للکارا جن کے فکر عمیق نے روح مذہب کی اتھاہ گہرائیوں کو پا لیا - جس نے ہماری سسکتی ہوئی معاشرت کے زخموں پر مرہم رکھا ہمارے لڑکھڑاتے ہوئے تمدن کو سہارا دیا اور ہمارے آئندہ عروج و ترقی کے لامحدود امکانات کی نشان دہی کی - بقول گرامی :

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

---

۱ - مغز و مزہ ، آغا صادق ، کوئٹہ ، ۱۹۶۹ء ، ص ۲۵ تا ۴۹

مبدائے فیاض کا نادر عطیہ کہیے یا دنیائے شعر کی خوش قسمتی کہ اقبال کی ہمہ گیر طبیعت میں فلسفے اور شعر کا ایک حسین امتزاج ہے ، اقبال اگر شاعر نہ بھی ہوتا تو صرف اس کا تعمیری فکر ہی علمی دنیا پر ایک احسان عظیم ہوتا ۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال نے اپنے بلند پایہ خیالات کو شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے جس سے اس کا پیام دلنشیں ، دلآویز ، سہل الفہم ، اور مؤثر ہوگیا ہے ۔ لیکن ارباب نظر جانتے ہیں کہ اس کی حقیقی عظمت کا راز اس کی شاعری میں نہیں ۔ بلکہ اس کے تعمیری فکر اور عمیق تفسیر حیات میں مضمر ہے ۔ یہ محض ایک صالح تنقید حقائق اور واضح تنقیح معارف کا ثمرہ ہے کہ اقبال تاریخ فکر انسانی میں ایک بلند مقام پر فائز ہے اور اقبال کو اس کا احساس بھی ہے ۔ اس لیے وہ بار بار محدود معنی میں اپنی شاعری سے انکار کرتا ہے ۔ اسے بار بار سطح بیں اور کم نظر نادان دوستوں کے خلاف احتجاج کرنا پڑا جو اسے صرف شاعر سمجھتے ہیں :

آشنائے من ز من بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت

من شکوہ خسروی او را دہم
تخت کسریٰ زیر پائے او نہم

او حدیث دلبری خواہد زمن
رنگ و آب شاعری خواہد ز من

اسے صاف صاف کہنا پڑا :

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن است !

وہ پہلے ، پہلے ایسے محدود نظر ناقدوں سے شاکی رہا جنہوں نے اسے صرف غزل گو شمار کیا ۔ لیکن آخری ایام میں یہ امر اس کے لیے طمانیت بخش ہوا ۔ کہ نکتہ رس اصحاب اس کا مقصد پا گئے ۔ اور اس کی شاعری

کی ثانوی حیثیت کا اعتراف کرنے لگے - اب اسے ایک گونہ اطمینان قلب حاصل ہوا تو اس نے کہا :

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

ہم اس مقالے میں اقبال کے ماخذوں کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں - سب سے پہلے ان سطحی خیالات کی تردید ضروری ہے جو اقبال نافہم دماغوں کی تراوش ہیں - اقبال پر عام طور پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے فلسفے کی بنیاد یورپ کے فلاسفہ' جدید خصوصاً مشہور المانوی مفکر نطشے اور فرانسیسی مفکر برگساں کے افکار پر رکھی ہے - لیکن ان مفکرین کے افکار کا بنظر امعان مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بہ دلائل قطعی ثابت ہوتی ہے کہ یہ مماثلت یا مشابہت بالکل سطحی اور معمولی سی ہے اور اقبال بذاتِ خود ایک مخصوص فلسفے کا مخترع ہے - یہاں یہ اصول مسلمہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ کوئی مجدد فن اپنے پیشروؤں کے خیالات سے ناآشنا نہیں رہ سکتا -

یہاں یہ تاریخی حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یورپ نے اپنی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بھی مسلمانوں کے علمی ثمرات اور تحقیقات و اکتشافات پر رکھی - مشرق وسطیٰ اور جنوب مغربی یورپ میں علم و عرفان کی جو شمع روشن کی گئی تھی ، اس سے علمائے یورپ نے اپنے چراغ روشن کیے - اور جبل الطارق کی چوٹیوں پر تہذیب و تمدن کے جو مینار بلند کیے گئے ، بھٹکتا ہوا یورپ انہی سے صدیوں رہنمائی حاصل کرتا رہا - اقبال نے اگر کہیں کہیں بعض مفکرین یورپ کے حیات افروز صالح افکار سے اتفاق کیا ہے یا بنظر استحسان دیکھا ہے تو اس کی اصل بھی اسلامی افکار سے جا ملتی ہے - مشہور حدیث ہے :

الحکمت ضالۃ المومن نحیث و جد ھا فھوا حق بھا

ترجمہ : ''یعنی حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے جہاں آسے مل جائے اس پر اس کا زیادہ حق ہے اس کی خوشہ چینی بھی اسلامی افکار ہی کی خوشہ چینی ہے ''

جن افکار جدیدہ سے اقبال کے خیالات کی مماثلت پائی جاتی ہے ۔ ان میں نطشے کے ''فوق البشر'' اور اقبال کے ''مردِ کامل'' کا تصور بھی ہے ۔ لیکن دونوں کے خصائص میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ نطشے کا فوق البشر یعنی مستقبل کا اعلیٰ انسان ظالم و جابر و خود غرض اور حریص شخصیت ہے ۔ وہ رحم ، اخلاق عفو و احسان کے خصائل حسنہ سے قطعاً معرا ہے ۔ لیکن اقبال کے مردِ کامل کے عناصر چہارگانہ میں قہاری و جبروت کے علاوہ قدوسی و غفاری بھی ہیں :

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

بر خلاف اس کے نطشے کا فوق البشر قانون کا پابند نہیں ۔ اس کے عمل کا معیار صحیح ہو یا غلط ، اچھا ہو یا برا ۔ اس کا اندھادھند تصرف تغلب ہے ۔ لہذا نطشے فوق البشر کی تخلیق کو حیاتیاتی ذرائع پر منحصر سمجھتا ہے ، یعنی مستقبل کا یہ انسان بہتر سے بہتر نسل کشی کا نتیجہ ہوگا ۔ یہ ہوگا انسان کا نجات دہندہ :

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

گویا نطشے کا فلسفہ، جو اس نے اپنی کتاب (Thus Spake Zarathustra) میں بزعم خود پیغمبرانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔ نسلی برتری کے گرد گھومتا ہے ۔ اسی فلسفے کے زیر اثر جرمن قوم کی نسلی قومیت کے عقیدے پر ہٹلر نے تسخیر عالم کا منصوبہ باندھا ۔ جس کا حشر دنیا نے دیکھ لیا ۔ اقبال کا مردِ مومن یا مردِ کامل نطشے کے فوق البشر سے اجتماعی اعتبار سے افضل ہے ۔ وہ صفاتِ جمالی اور جلالی دونوں کا حامل ہے ۔ اس میں فقر و شاہی ، جنیدی و اردشیری اور ناز و نیاز پہلو بہ پہلو موجود ہیں ۔ ملاحظہ ہو اس کی سیرت :

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل

اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز

نرم دم گفتگو ، گرم دم جستجو

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اسی طرح برگسان کے فلسفہ٭ زمان کا اقبال ایک حد تک موید ہے۔ مثلاً برگسان وقت کو ایک خط مستقیم کی صورت میں نہیں تصور کرتا۔ جسے ماضی ، حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جا سکے۔ وہ کسی خارجی وقت کا قائل نہیں۔ بلکہ وہ حقیقی وقت کا۔ جسے انسان اپنے ذہن کی گہرائیوں میں مستقل طور پر محسوس کرتا ہے اقبال بھی اسی داخلی وقت کا قائل ہے:

تو اسے پیمانہ٭ امروز فردا سے نہ ناپ

جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

یا واضح تر الفاظ میں کہتا ہے:

در دل خود تخم ظلمت کاشتی

وقت را مثل خطے پنداشتی

اے اسیر دوش و فردا در نگر

در دل خود عالمِ دیگر نگر

یہاں تک برگسان کی ہمنوائی تھی لیکن آگے چل کر حضور صلعم کی مشہور حدیث ہے جو مسئلہ٭زمان کی شرح کی ہے وہ اقبال ہی کا حصہ ہے:

تا کجا در روز و شب باشی اسیر

رمز وقت از لی مع اللہ یاد گیر

اشارہ ہے حدیث شریف کی طرف "لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ نبی مرسل و لا ملک مقرب۔"

(یعنی میرے لیے ایسا بھی ہوتا ہے۔ جب نہ کوئی نبی میرے پاس پھٹک سکتا ہے اور نہ کوئی مقرب فرشتہ) مراد یہ کہ الہی اور ذات الوہیت کے سوا مجھے کسی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے

کہ وقت کی اصل حقیقت ان باطنی اور الہامی واردات پر مبنی ہے جو روح کی گہرائیوں سے ابھرتے ہیں -

نیز برگسان عقل کو ناکارہ یا نارسا سمجھتا ہے اور معرفت اشیاء کے لئے وجدان کا قائل ہے - اقبال بھی عقل کی ایک حد ٹھہراتا ہے جس سے آگے یہ نہیں جا سکتی اور انتہائی صداقتوں کی منزل عشق ہی کی بدولت حاصل ہوتی ہے -

اس سرسری مماثلت سے قطع نظر اقبال نے برگسان کے عقیدۂ حیات کی مطلق العنانی ، بے راہ روی اور بے مقصدیت پر کڑی تنقید کی ہے - برگسان نے زندگی کو بے شعور ، بے ارادہ اور بے نتیجہ ٹھہرایا ہے - لیکن اقبال نے اسے بابصر ، صاحب شعور اور فعال بالارادہ ثابت کیا ہے -

یہاں تک تو ہم نے موضوع کا سلبی پہلو اختیار کیا ہے - اب اس کے ایجابی پہلو پر نظر ڈالتے ہیں - مفکرین اسلام میں سے اقبال نے سب سے زیادہ جس کا اثر قبول کیا وہ مولانا جلال الدین رومی ہیں - وہ انہیں اپنا پیر و مرشد اور روحانی رہنما تسلیم کرتا ہے - اور خلوص و عقیدت و جذب و شوق سے ان کی ہدایت کا معترف اور ان کے روحانی تصرف کا قائل ہے - چنانچہ کہتا ہے :

پیر رومی آن حکیم پاک زاد
سر مرگ و زندگی برما کشاد
پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
موجم و در بحر او منزل کنم
تا در تابندۂ حاصل کنم !
منکہ مستی ہا ز صہبائش کنم !
زندگانی از نفس ہائش کنم

اقبال پہلا صاحب نظر ہے جس نے رومی کو دیگر صوفیائے کرام سے

تمیز کیا - ورنہ اس سے پہلے وہ بھی ان ہی صوفی شعرا میں محسوب تھے جنھوں نے اسلام کی غیر اسلامی تعبیر سے اس کے اصل خط و خال کو مسخ کر دیا - اقبال نے ایسے ہی تصوف پر ضرب کاری لگائی جس میں ایک طرف بدھ ازم کے نروان اور قدیم ہندو مذہب کی ویدانت کی منفی اقدار حیات ، مثلاً نفی ذات ، ترک دنیا ، فنائے ہستی ، جمود و بے عملی اور تقدیر پرستی کے عناصر شامل ہو گئے تھے - اور دوسری طرف افلاطون کے خواب آور فلسفہ اعیان کے اجزا سرایت کر چکے تھے - اقبال کی حافظ پر تنقید بھی ایسے ہی منفی اور خواب آفرین تعبیرات حیات کے خلاف ہے ورنہ وہ اس کے شاعرانہ کمال کا معترف ہے - حقیقت یہ ہے کہ رومی نے قرون وسطیٰ کی ظلمتوں میں شمع ہدایت روشن کی اور علی الاعلان کہا :

چند چند از حکمت یونانیان ؟
حکمت اسلامیان را ہم بخوان

اور اقبال نے دانش حاضر کے فتنوں سے ہمیں یہ کہہ کر متنبہ کیا کہ :

چہرۂ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر !

دوسرے بزرگ جن سے اقبال اثر پذیر ہوا مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی ہیں جن کے اجتہاد نے ہندوستان میں سب سے پہلے وحدت الوجود کے خلاف وحدت شہود کا فلسفہ پیش کیا - بالالفاظ دیگر ہمہ اوست کی بجائے ہمہ از اوست کی تعلیم دی - عقیدہ ہمہ اوست کا مفہوم یہ ہے کہ تمام مظاہر کائنات واجب الوجود کے عین ذات ہیں - یعنی باری تعالیٰ کے سوا کسی چیز کا جداگانہ وجود نہیں - اس عقیدے کی رو سے مظاہر کا ذات الوہیت میں سما جانا لازم آتا ہے جو حلول کے قریب پہنچ جاتا ہے - اس عقیدے کے نتیجے میں انسان کی جداگانہ شخصیت صفر ہو جاتی ہے - اور جبر ، بے بسی اور پستی کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں - مجدد الف ثانی کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے مظاہر قدرت ، ذات باری تعالیٰ پر شاہد عادل ہیں اور اس عالم کا ذرہ ذرہ اس کی ذات پر گواہی دے رہا ہے انسان بھی اس کی قدرت کاملہ کا مظہر اتم ہے - اور اس ہستی مافوق الادراک کی

ایک روشن دلیل ہے - زندگی کے اس حرکی تصور سے ہمہ اوست کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوگیا - یہی سبب ہے کہ اقبال نے متعدد مقامات پر مجدد الف ثانی کی حیات پرور تعبیر زندگی کو خراج تحسین ادا کیا ہے -

اقبال نے سب سے زیادہ قرآن و حدیث اور سنن و احکام شریعت کو اپنے فلسفے کی اساس بنایا ہے - وہ اسلامی معتقدات و اعمال کا مفسر ہے - تعلیمات اسلامی ہی اس کے فکر کے سب سے بڑے ماخذ ہیں - اس کی شاعری ایمان و ایقان کی شاعری ہے - وہ اسلامی علم و عمل کا ایک انتھک نقیب ہے - وہ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا پرسوز حدی خوان ہے ان کا فلسفہ حیات اسلامی و ذہنی ارتقا کی ایک کڑی ہے - آیات قرآنی اور احادیث نبوی اس کے ذکر و فکر اور حال و قال کا محور ہیں - اس کے افکار ، جذبات ، حسیات ، اشارات ، کنایات اور تلمیحات پر قرآن اور حدیث چھائے ہوئے ہیں حضور صلعم سے خطاب کرتے ہوئے کس سوز و ساز اور خلوص و نیاز سے کہتا ہے :

گرد لم آئینہ بے جوہر است
در بحر قم غیر قرآن مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن
این خیابان را ز خارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پا کن مرا
گر در اسرارِ قرآن سفتہ ام
با مسلمانان اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گردان مرا
آب نیسانم گہر گردان مرا

اب ہم اقبال کے بنیادی فلسفہ خودی کا تجزیہ کر کے دیکھتے ہیں کہ کہاں تک ہم اور خود اقبال اس دعوے میں حق بجانب ہے - لفظ ''خودی'' اب تک غرور و تکبر کے معنوں میں مستعمل رہا جو اخلاق رذیلہ میں سے ہیں - لیکن اقبال نے اس لفظ سے احساس ذات یا شعور زندگی یا شخصیت و انفرادیت مراد لئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ صدیوں

اس لفظ کی تحقیر و تذلیل ہوتی رہی اس کی ذلت و حقارت پر جسے خود خدا سے لفظی و معنوی نسبت ہے خدا کو بھی غیرت آئی۔ آخر اس نے ایک مردِ خوددار پیدا کیا۔ جس نے قرنوں کے اس مطعون و منفور لفظ کو نئے معنی بخش کر ہمیشہ کے لئے عزت و احترام کا مستحق بنایا۔

اقبال کا یہ خیال کہ عالم، افراد کا مجموعہ ہے، جس میں سے ہر ایک جداگانہ خودی یا انفرادیت رکھتا ہے اور یہ کہ کامل ترین خودی خدائے تعالیٰ کی ہے، انسانی خودی اس کی ذات سے مستیز رہتی ہے ارشاد ربانی صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ (یہ اللہ کا رنگ ہے اور اللہ کے رنگ سے کون سا رنگ بہتر ہو سکتا ہے) اور فرمان نبوی تخلقوا باخلاق اللہ (اللہ کے اخلاق سے اپنے آپ کو متصف کرو) پر مبنی ہے اور بخلاف عقیدہ متصوفین کہ روحِ انسانی ذات باری تعالیٰ میں مدغم ہو جاتی ہے۔ اقبال کا یہ عقیدہ کہ جسم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد بھی روح اپنی جداگانہ ہستی قائم رکھتی ہے قرآنی تصور معاد کی ایک توجیہ ہے جس کی رو سے بندہ و خدا، عبدو معبود، اور شاہد و مشہود کی غیرت ثابت ہے، انا یا خودی کی حقیقت بیان کرنے کے بعد اس کے جو عوامل قرار دیے ہیں. یعنی تخلیقی مقاصد اور عشق وہاں بھی اقبال نے اسلامی زندگی کا نصب العین پیش کیا ہے ملاحظہ ہو:

زندگانی را بقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دل خود زندہ دار
تانگردد مشت خاک تو مزار

جس کا مطلب ہے کہ زندگی بے مقصد نہیں ہے قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے: افحسبتم انما خلقنا کم عبثاً و الکم الینا لا ترجعون (کیا تم گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمھیں عبث پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف، لوٹ کر نہ آؤ گے) اور خلق الموت و الحیات لیبلوکم ایکم احسن عملا

(موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص زیادہ اچھا ہے) پھر انسان کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے یہ آیت کریمہ ملاحظہ ہو :

فتبارک اللہ احسن الخالقین (اللہ تبارک و تعالیٰ سب خالقین میں بہتر خالق ہے) ذات باری تعالیٰ بہترین خالق ہے اس سے دوسرے خالقوں کا اثبات ہوتا ہے - ازاں جملہ انسان بھی چھوٹے پیمانے پر ایک خالق ہے اور زندگی کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے - جو انسان تخلیقی سرگرمی سے معرا ہے حقیقی معنی میں انسان نہیں - چنانچہ اقبال مصر ہے :

ہر کہ او را لذتِ تخلیق نیست
پیش ما جز کافر و زندیق نیست

اور اقبال کے عشق سے مراد جناب سرور کائنات کا عشق ہے :

در دل مسلم مقام مصطفیٰ ؐ است
آبروئے ما زنام مصطفیٰ ؐ است
خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اس استدلال کا سرچشمہ کلام مجید کی اس آیت کے سوا کیا ملے گا - ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو تا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ٹھہرو) -

اقبال نے خودی کی تربیت کے جو مراحل سہ گانہ بیان کیے ہیں ان کی اصل بھی قرآن و حدیث سے باہر نہیں ہے - مرحلہ اول یعنی اطاعت سے مراد دستور العمل کی اطاعت ہے جو رسول صلعم کی وساطت سے امت کو دیا گیا - اس مرحلے پر مرد مومن من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (جس نے رسول ؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی) اور اطیعو اللہ و اطیعو الرسول ؐ و اولی الامر منکم (تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول ؐ کا

کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اہلِ حکومت ہیں ان کا بھی) کا مصداق ہوتا ہے:

تابع حق دیدنش نادیدنش خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش

اسی جذبہٗ اطاعت سے جذبہٗ قربانی پیدا ہوتا ہے۔ اسی جذبہ کے زیرِ اثر حضرت خلیل اللہ اپنے لختِ جگر کے گلے پر چھری رکھ دیتے ہیں اور اسی جذبہ کے زیرِ اثر سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی جان، مال، اولاد اور اعزہ کی قربانی پیش کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کی آیت کریمہ قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین (کہہ دیجیے میری نماز میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے) کا بھی یہی مفہوم ہے۔

مرحلہ دوم ضبط نفس ہے۔ اس مرحلے پر مردِ مومن، خوف دنیا، خوف مرگ اور خوفِ آلام زمین و آسمان پر غالب آ جاتا ہے اور حب مال، حب عیال اور حب جاہ کو زیر کر لیتا ہے یہاں بھی اقبال توحید میں پناہ ڈھونڈتا ہے اور کہتا ہے:

تا عصائے لا الہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بند زن و اولاد شد

یہ اشعار دراصل آیات قرآنی لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون (نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں) اور لا تحزن ان اللہ معنا (ڈرو نہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ ضبط نفس کس طرح کیا جائے۔ تو اقبال تعلیمات قرآن کی روشنی میں فرائض کی بجا آوری کو اس کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبادت مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ تقویٰ پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جیسا کہ نص صریح لیس البران تولواوجوھکم قبل المشرق و المغرب (کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو

یا مغرب کو) سے ثابت ہے۔ اقبال نماز، روزہ، حج زکواۃ کے فرائض کا فلسفہ فرداً فرداً اس طرح بیان کرتا ہے:

لا الہ باشد صدف گوہر نماز
قلب انسان را حج اصغر نماز
در کف مسلم مثال خنجر است
قاتل فحشا و بغی و منکر است
روزہ برجوع و عطش شب خوں زند
خیبر تن پروری را بشکند!
مومناں را فطرت افروز است حج
ہجرت آموز و وطن سوز است حج
حب دولت را فنا سازد زکواۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکواۃ

مرحلہ سوم نیابت و خلافت الٰہیہ ہے جب مرد مومن پہلے دو مرحلوں سے گزر جاتا ہے تو اس مقام جلیل پر فائز ہو جاتا ہے اور و لقد کرمنا نبی آدم (ہم نے آدم کو فضیلت بخشی) اور انا عرضنا الامانت ---۔ الخ (ہم نے یہ امانت پیش کی ----) کا محل بن جاتا ہے۔ اسی مقام کی طرف اقبال اس طرح اشارہ کرتا ہے:

نائب حق ہمچو جانِ عالم است
ہستیٔ او ظلِ اسم اعظم است
از رموز جز و کل آگہ بود
در جہان قائم با امر اللہ بود
پختہ سازد فطرت ہر خام را
از حرم بیروں کند اصنام را
نوع انسان را بشیر و ہم نذیر
ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر

اقبال کا فلسفۂ اجتماع اسلام کے جمہوری نظام ہی کی توضیح ہے۔ اقبال سیاسین یورپ کے برعکس مذہب اور سیاست کی ثنویت کو تسلیم نہیں

کرتا۔ اس کا خیال ہے کہ اس تفریق سے فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اس دوئی کو تہذیب کی بے بصیری قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

خلیفۂ وقت مسجد میں امام بھی ہے اور میدانِ جنگ میں سپہ سالار بھی۔ اجتماعی زندگی کے تمام شعبے مثلاً سیاست، صنعت، تجارت، زراعت اور معاشرت مذہب ہی کے تحت آ جاتے ہیں:

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و ملت ہیں فقط حفظ حرم کا اک ثمر

اقبال کے نزدیک توحید کا مطلب ہے خدا کی حاکمیتِ مطلقہ کا اقرار اور قوم، نسل، وطن، وراثت، قرابت، ملا اور صوفی کی اطاعت سے انکار۔ توحید سے قلوبِ انسانی میں ہم آہنگی، یگانگت اور اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ ایک خدا کو ماننے کا لازمی نتیجہ ہے کہ خدا کو ماننے والی جماعت بھی ایک ہو جائے۔ اسی کو اخوت کہتے ہیں:

اسود از توحید احمر می شود
خویش فاروق(رض) و ابوذر(رض) می شود
ملتِ از یک رنگی دلہاستے!
روشن از یک جلوہ سیناستے
مدعائے ما مآلِ ما یکیست
طرز و انداز و خیال ما یکیست
ما ز نعمت ہائے او اخوان شدیم!
یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

اسی طرح رسالت بھی ایک اجتماعی ادارہ ہے جس سے مراد ایک دینی قیادت کی اطاعت ہے۔ اسی اطاعت سے جماعت کی تشکیل ہوتی ہے:

از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است
جزو ما از جزو ما لاینفک است

قرآن اس جماعت اور قوم کے لیے دستور العمل یا آئین ہے۔ جو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے :

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

جس طرح ہر جماعت کا ایک مرکز ہوتا ہے۔ ملت مسلمہ کا مرکز کعبہ ہے اور تمام دنیا اس کا دائرہ ہے :

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

چونکہ یہ جماعت توحید و رسالت پر مبنی ہوتی ہے اس لیے عالمگیر ہے۔ کوئی خاص مقام اس کا وطن نہیں :

جوہر ما بامقامے بستہ نیست — بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفال جام ماست — رومی و شامی گل اندام ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست — مرزبوم او بجز اسلام نیست

اقبال کے نزدیک نظام سیاست، جمہوریت اور شخصیت کا ایک معقول امتزاج ہے۔ وہ مغربی جمہوریت کو ملوکیت ہی کی شکل سمجھتا ہے :

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس و اصلاح و آئین و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اس جگہ ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے اقبال نے سرمایہ داری کی مذمت اور مزدور کی حمایت میں آواز بلند کی ہے مثلاً :

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

لیکن یہ آوازِ حق روسی مفکر کارل مارکس کی اشتراکیت کی شرمندۂ احسان نہیں ہے اور اس انقلاب سے روسی طرز کا انقلاب مراد نہیں ۔ بلکہ موجودہ عدم مساوات کو اسلامی معاشی مساوات میں تبدیل کرنے کا جذبہ ہے ۔ اقبال نے روسی اشتراکیت پر زبردست تنقید کی :

دین آں پیغمبر حق ناشناس　　بر مساواتِ شکم دارد اساس

اشتراکیت شکم یعنی مادی تقاضوں سے ایک قدم بھی آگے نہیں جاتی ۔ یہ انسان کے اخلاق اور روحانی تقاضوں کی آرا بھی تسکین نہیں کرتی ۔ کیونکہ یہ روحانیت کی قائل ہی نہیں ۔ اگرچہ اخلاق کی مدعی ضرور ہے ۔ اس لیے اقبال اسے دعوت دیتا ہے :

کردہ کار خداوندان تمام
از مقام لا سوئے الا خرام

یعنی تو نے صرف لا تو کہا ہے ۔ اب الا اللہ بھی کہہ کر مشرف بہ اسلام ہو جا ۔ حقیقت یہ ہے آئین اسلام نے ہی روحانیت اور مادیت کا قوام معتدل تیار کیا ہے اور دین و دنیا کو اس طرح جوڑا ہے کہ کہیں جوڑ نہیں کھلتا :

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں ، نے فقیر رہ نشیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

مثنوی ''اسرار و رموز'' کے آخر میں اقبال نے سورہ اخلاص کی جو شرح کی ہے۔ چونکہ وہ اس کی بنیادی تعلیم کا نچوڑ ہے۔ اس لئے ہم یہ مضمون اسی کی شرح پر ختم کرتے ہیں۔ استدلال ملاحظہ ہو کہ جب اللہ ایک ہے تو اسے ماننے والی جماعت کو بھی ایک ہونا چاہیے :

با یکے ساز از دوئی بردار رخت
وحدتِ خود را مگرداں لخت لخت

اور جب اللہ تعالی ''صمد'' یعنی بے نیاز ہے تو مسلمان کو بھی غیر اللہ سے بے نیاز ہو جانا چاہیے :

مسلم استی بی نیاز از غیر شو
اہلِ عالم را سراپا خیر شو

جب اللہ کی شان ''لم یلد و لم یولد'' (نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی) تو مسلمانوں کو بھی خون، رنگ، گوشت و پوست پر فخر نہیں کرنا چاہیے، اور ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم (تم میں سب سے بزرگ وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے) کو معیار شعار بنانا چاہیے :

فارغ از باب و آم و اعمام باش
ہمچو سلمان زادۂ اسلام باش

حضرت سلمان فارسی سے لوگوں نے ان کا شجرۂ نسب پوچھا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ سلمان ابن اسلام! لم یلد و لم یولد کا عرفان ہی اقبال سے یہ کہلواتا ہے :

نیست از روم و عرب پیوند ما
نیست پابند نسب پیوند ما

سب سے آخر چونکہ ولم یکن لہ کفواً احد (اور نہ کوئی اس کے

برابر ہے) اللہ تعالیٰ کی صفت ہے تو مسلمان کو بھی اپنا شریک پسند نہیں کرنا چاہیے ۔ ملتِ مسلمہ کی شان تو یہ ہے :

حرفۂ لا تحزنوا اندر برش
انتم الاعلون تاجے برسرش

سورۂ اخلاص کا تقاضا یہ ہے ، کہ بندے کو مولا صفات بن جانا چاہیے ۔ اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اقبال کا سرچشمۂ خیال فلسفۂ مغرب ہے یا تعلیمات اسلام[1] ۔

* * *

۱۔ مغز و مزہ ، آغا صادق ، کوئٹہ ، ۱۹۶۹ء ، ص ۲۵ تا ۴۹

پروفیسر آغا صادق حسین

اقبال کا مرکزی خیال

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ترجمانِ حقیقت، نباضِ فطرت، شاعر مشرق، مفسر حیات علامہ
اقبال کا یہ شعر انسانی شخصیت کی روشن تشریح، انسانی انفرادیت کا ایک
واضح بیان اور مقام بندگی کی ایک بین تفسیر ہے۔ علامہ مرحوم کی تمام
شاعری کا نچوڑ تمام تعلیمات کا خلاصہ اور تمام تلقینات کا لب لباب یہی
مرکزی خیال یہی نقطۂ خودی ہے۔ اس شعر کی شرح شاعر مشرق کے
حیات پرور پیغام کی شرح ہے۔ اسی ایک لفظ میں اقبال کا جہانِ معنی اور
دنیائے حقیقت مضمر ہے۔ یہ شعر ہمیں اقبال کی دنیائے فراخ میں لے جاتا
ہے، جہاں رجائیت ہی رجائیت ہے۔ جہاں قنوطیت دم نہیں مار سکتی۔
جہاں زندگی سانس لیتی ہے۔ جہاں حیاتِ جاوداں کے چشمے ابلتے ہیں۔
جہاں علو و اقتدار کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ جہاں جوش عمل، جوش
کردار کے نعرے تو سنائی دیتے ہیں لیکن محض گفتار کے غازیوں کی
چیخیں سنائی نہیں دیتیں جہاں جستجو ہے، تگ و دو ہے۔ جہدِ للبقا
ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

کہنا گناہِ عظیم ہے۔ جہاں دل شکن مایوس کن نوحے پڑھنا حرام
ہے۔ یہ وہ دنیائے طربناک و نشاط آفریں ہے، جہاں انسانی روح اپنی
عظمت اور شاہراہ مستقبل کے گیت گاتی ہے:

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشا کش مگر یہ دریا کے پار ہو گا

یہ شعر اقبال کے فلسفۂ خودی کا آئینہ دار ہے جس نے خودی کو سمجھ لیا اس نے اقبال کے پیغام عالمگیر کو سمجھ لیا اقبال کی تڑپتی ہوئی روح کو دیکھ لیا اور اقبال کے دھڑکتے ہوئے دل سے ہم آغوش ہوگیا ۔ لہذا ہمیں اس مختصر سے مضمون میں اسی خودی کا جائزہ لینا ہے ۔

لفظ خودی اقبال سے پہلے مذموم معنوں میں استعمال ہوتا تھا ۔ اس سے غرور و تکبر ، خود پرستی و خود غرضی ایسے تمام اخلاق اور عادات سفلی عبارت تھے جن کے تصور سے انسان کو نفرت ہو اور جن کے ذکر سے طبیعت کو گھن آئے لیکن اقبال نے اس لفظ کے معنی بدل ڈالے ۔ اقبال نے اس لفظ سے خود اعتمادی ، خودداری اور عزت نفس ایسے اخلاق عالیہ سے لے کر انسانیت کا بلند مقام اور عبودیت کے ارفع کردار تک مراد لئے ہیں اور صدیوں کا یہ مکروہ اور منفور لفظ ہماری عزت و احترام کا مستحق ہوگیا ہے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقام بندگی کیا ہے عبودیت کا یہ بلند معیار کون سا ہے اور انسانی شخصیت کا یہ طرۂ امتیاز آخر ہے کیا جو اقبال کا مہتم بالشان موضوع اور محبوب مرکز خیال ہے ۔ تو سنیئے یہ وہی مقام ہے جس کے درد و سوز کے عوض ، جس کی متاع بے بہا کے بدلے ہمارے خوددار اقبال شانِ خداوندی لینے پر رضامند نہیں :

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

یہ اناعرضنا الامانت کا مقام بلند ہے یہ درجہ و لقدکرمنابنی آدم کا درجہ ارفع اور یہ فضیلت سخرلکم مافی السمٰوت والارض کی فضیلت مخصوص ہے ۔ انسان زمین پر خدا کا نائب ہے ۔ خدا کا معتمد اور امین ہے خدا کا خلیفہ ہے ۔ یہ اسی کے قوانین عالمگیر زمین پر نافذ کرتا ہے اس کی صفات عالیہ سے اپنے آپ کو متصف کرتا ہے اور اس کے رنگ میں اپنے

آپ کو رنگتا ہے۔ اسی لئے اسے حکم ہوا ہے تخلقو با خلاق اللہ ۔ اسی لئے تو اس کے حق میں کہا گیا ہے صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ ۔

اسلام کے نظریات حیات میں انسان ایک مجبور اور بے بس ذات یا ایک منفی حقیقت نہیں بلکہ معین اقدار کا حامل اور مثبت صفات کا امین ہے ۔ لیکن وہ بحکم خدا فاعل مختار کائنات میں متصرف اور تخلیقی قوتوں کا مظہر ہے ۔ علم اشیاء سے باخبر ہونا اس کا وظیفہ حیات ہے ۔ کائنات کی گتھیوں کو سلجھانا اس کا لائحہ عمل ہے اور عناصر کی باگ ڈور تھامنا اس کا پیدائشی حق ہے ۔ ہوا کے جھونکے اس کے فراش ، سورج کی کرنیں اس کے باورچی اور بجلی کی لہریں اس کی پیغامبر ہیں ۔ فطرت کی قوتوں کی تسخیر اس کی امتیازی شان ہے آب و خاک و بادو آتش سے استخدام اس کا لازمہ حیات ہے اور اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانا اس کا فرض عین ہے اور اسی لئے اسے پیدا کیا گیا ہے اور یہی تسخیر کائنات خدا کے قانون کی اطاعت ہے ۔ اس کے لیے اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنا عبادت ہے ۔ عناصر پر اپنی فوقیت اور اپنے آپ پر خدا کی حاکمیت مطلق کا اقرار ہی اسلام کا اصول حیات ہے ۔ انسانیت کے اسی مقام کو سمجھنا اور اسے حاصل کرنا ہی مقام بندگی ہے ۔

کائنات کا عرفان اپنا عرفان اور ذات خداوندی کا عرفان ہی انسان کامل کی صفات سہ گانہ ہیں اور جب انسان اس منصب عالیہ پر فائز ہو جاتا ہے تو انسان کی تدبیر خدا کی تقدیر کے موافق ہو جاتی ہے اور یہی انسان و مارمیت اذرمیت ولا کن اللہ رمٰی کا مظہر اتم بن جاتا ہے اور یداللہ فوق ایدیھم کا مصداق حقیقی بن جاتا ہے ۔ خدا کی رضا بندے کو مطلوب ہوتی ہے اور بندے کی رضا خدا کو مطلوب ۔ رضی اللہ عنھم و رضوعنہ کا یہی مطلب ہے :

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے[۱]

---

۱ - مغز و مزہ ، آغا صادق ، کوئٹہ ، ۱۹۶۹ ، ص ۶۱ تا ۶۵ ۔

پروفیسر آغا صادق حسین

اقبال اور مناظرِ قدرت

ایک ترشے ہوئے نگینے کو جس پہلو سے دیکھئے ایک نیا رنگ جلوہ گر ہوگا اور ایک نئی آب و تاب نظر آئے گی ۔ اس طرح علامہ اقبال کے ہر کلام کی ہر حیثیت اثر ، کشش اور جاذبیت رکھتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ دنیائے ہست و بود کی طرح یہ بھی :

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

زندہ شاعر کا کلام زندگی کا ترجمان ہوتا ہے ۔ زندگی کی روح اس کے رگ و ریشے میں اس طرح پیوست ہوتی ہے جیسے آئینے میں جوہر و جلا اور آفتاب میں تمازت و ضیا :

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

اور کلام کے جاندار ہونے کی ایک یہ بھی نشانی ہے کہ باربار پڑھنے سے بھی طبیعت پر گراں نہ گزرے بلکہ ہر بار ایک نئی لذت محسوس ہو ۔

اقبال نے کیا کہا ہے اور کس طرح کہا ہے ۔ نہ صرف شاعری بلکہ فلسفہ ، مذہب اور سیاست کے معرکتہ الآراء مسائل ہیں خدا خودی ، مقام عبودیت ، مقصدِ حیات ، ملت و وطن وغیرہ ان کے جلیل القدر موضوعات ہیں ۔ اس مختصر مقالے میں ہم ان کی مختلف حیثیتوں سے قطع نظر کر کے صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اقبال کے موئے قلم نے مناظر قدرت کی تصویر کس طرح کھینچی ہے ۔

اس سلسلے میں اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ اقبال، ماسوائے معدودے چند لفظوں کے مناظر قدرت کو بطور پس منظر پیش کرتا ہے تاکہ اصل موضوع یا پیام میں ایک دلکش اور اثر پیدا ہو جائے۔ مثلاً گل پژمردہ کی تصویر کشی اس لئے ضروری ٹھہری کہ وہ شاعر کی اپنی افسردہ زندگی کا ترجمان ہے:

میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو

ماہ نو سے اس لئے مخاطب ہو رہا ہے کہ شاعر اس دنیا کی تاریکیوں سے اکتا کر روشنی کی تلاش میں ہے:

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں

ہمالیہ کی سربفلک چوٹیاں اس کے لئے کیوں جاذب توجہ ہیں، اس لئے کہ اس کی قدامت کا تخیل اسے اس عہد قدیم میں لے جاتا ہے جب انسان سادگی اور بے تکلفی کا مجسمہ تھا اور تہذیب و تمدن کی مکاریوں سے اس کا دامن پاک تھا:

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبادیٔ انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اسی طرح صبح کا ستارہ اس لیے لرزہ بر اندام ہے کہ آسے مآلِ حسن کی خبر مل گئی ہے اور اس سے زندگی کی بے ثباتی کا سبق ملتا ہے:

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند ہے زندگی کی مستی ہے

دو ستارے قریب آ کر پھر دور ہو جاتے ہیں تو اس راز کی نقاب کشائی ہوتی ہے:

ہے خواب ثباتِ آشنائی
آئین جہاں کا ہے جدائی

دوسرا امر جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے ۔ یہ ہے کہ اقبال مناظرِ قدرت پیش کرتے ہوئے سائنس کے جدید ترین مسلمات سے کبھی قطع نظر نہیں کرتا ۔ کاؤ زمین اور گردشِ فلک وغیرہ ایسے ایسے قدیم معتقدات علم طبیعی اور ہیئت کی تلمیحات مذہب شاعری میں اگرچہ جائز ہیں لیکن اقبال کی جدت طرازی نے تازہ ترین نظریات کو بعض اشعار کی بنیاد قرار دیا ہے ۔ مثلاً چاند کا زمین کے گرد پھرنا :

طوفِ حریم خاکی تیری قدیم خو ہے

چاند کا آفتاب سے روشنی حاصل کرنا :

تو سراپا سوز ، داغِ منت خورشید ہے

علی ہذالقیاس زحل کو زنارِ ہند کہتا ہے ۔ جو اس ستارے کی صحیح تصویر ہے ۔

اب رہا ہمارا اصل موضوع کہ اقبال نے عروسِ فطرت کی مشاطگی کا حق کس طرح ادا کیا ہے ۔ تو حقیقت یہ ہے کہ جس حسنِ لطافت ، حسن بیان اور اختصار سے مناظرِ قدرت کا نقشہ اس نے کھینچا ہے ۔ یہ بات بہت شاعروں کے حصے میں آئی ہے ۔ اگرچہ انتخاب مشکل ہے ۔ مگر چند اقتباسات دے کر اور وہ بھی اردو کلام میں سے چند تصویریں پیش کی جاتی ہیں :

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

ندی کی تصویر ملاحظہ ہو :

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ راہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراق دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

دامن کوہ میں جو ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنایا ہے۔ اس کی فضا دیکھنے کی چیز ہے:

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

دیکھئے ماہ نو کس طرح نمودار ہوتا ہے:

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب
نشتر قدرت نے کیا کھولی ہے فصد آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروس شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم و خام کی

جگنو فطرت کا ایک درخشندہ موتی تھا ہی شاعر کے تخیل نے اسے اور چمکا دیا:

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

کنار راوی پر شام کا نظارہ دیکھئے:

شراب سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامن شام
لئے ہے پیر فلک دست رعشہ دار میں جام

عدم کو قافلہ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا

کلی کس طرح کھلتی ہے:

سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

دریائے نیکر کے کنارے شام کا منظر وجد کی کیفیت پیدا کر رہا ہے:

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا

ذرا ستارے سے آنکھیں چار کیجئے:

قمر کا خوف ہے یا خطرۂ سحر تجھ کو
مآل حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو
متاع نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراسِ فنا صورت شرر تجھ کو
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
مثالِ ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے پھر تیری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے

اب یہ دیکھئے تاروں کی محفل کس طرح سجتی ہے:

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشت افق سے لے کے لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے زیور چاندی کے سب اتارے
محفل میں چاندنی کی پھیلائے ظلمت آئی
چمکے عروس شب کے موتی وہ پیارے پیارے

خضر راہ میں ساحل دریا پر ایک رات کا منظر ایسا ہے جس پر دنیائے شعر کو بجاطور پر ناز ہے۔ مصور کا موقلم بھی ایسی تصویر کشی سے عاجز ہے:

ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محو نظر
گوشہ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نرم سیر
تھی نظر حیران کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیرخوار
موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں محو خواب
رات کے افسوں ہیں طائر آشیانوں میں اسیر
انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب

اور خضر کی زبانی صحرا کی دلفریبیوں کا منظر محاکاتی شاعری کا شاہکار ہے :

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ خضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بام گردوں سے جبینِ جبرئیل
وہ سکوت شام صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں
اہل ایماں جس طرح جنت میں گرد سلسبیل

سردست ہم انہی اقتباسات پر اپنا مقالہ ختم کرتے ہیں۔ کیونکہ :

دامانِ نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین تو از تنگیٔ دامانِ گلہ دار[۱]

* * *

۱۔ مغز و مزہ ، آغا صادق ، کوئٹہ ، ۱۹۶۹ء ص ۶۷ تا ۵۶

اقبال کی شاعرانہ حیثیتیں

ہم اس مقالے میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کے چند راز مختصراً بیان کریں گے - حقیقت یہ ہے کہ اس صدی کے اس عظیم شاعر کے متعلق بنیادی حقائق یہی چار ہیں کہ :

۱ - اقبال شاعر حیات ہے -
۲ - اقبال شاعر اسلام ہے -
۳ - اقبال شاعر انقلاب ہے -
۴ - اقبال شاعر مستقبل ہے -

پہلی حیثیت شاعری حیات -

سینکڑوں سال کی اردو شاعری پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالئے ہمیں کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے - ولی دکنی سے غالب تک دیکھ جائیے - درد، سوز ، گداز ، حسرت ، عبرت ، یاس ، بلکہ موت تک ملے گی - لیکن زندگی نہیں ملے گی - پیام حیات نہیں ملے گا ، روح امید نہیں ملے گی - اقبال پہلا شاعر ہے - جس نے زندگی کے گیت گائے اور رجائیت کے نغمے چھیڑے - بانگ درا سے ارمغان حجاز تک جہاں سے چاہیں دیکھ لیجیے - مصرعہ مصرعہ میں وہی ولولہ، وہی تڑپ، وہی جذبہ عمل اور وہی جوش پیکار نظر آئے گا - قوت و عمل کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس کے آغوش میں ہزاروں طوفان ہیں اور جس کی ہر موج میں پیام زندگی ہے - مثلاً :

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسی زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج زخود رفتہ تیز تر خرامید گفت
ہستم اگر میروم گر نہ روم نیستم

اقبال سلامت برکنار است کا قائل نہیں ، بلکہ کشمکش امواج ہی میں حیات جاودان کا راز دیکھتا ہے اور کہتا ہے :

نمیارا بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز حیات جاوداں اندر ستیز است

ذرا اس شاعری اور اس شاعری کا فرق ملاحظہ ہو - کہاں موت کی وہ چیخیں کہ سینکڑوں سال سے دماغوں کو ماؤف کر رہی تھیں کہ :

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اور اس قسم کا بزدلانہ خوف یا :

کے دوانم دید ساقی جام صہبا بشکند
مے برور نکم حباب گر بدریا بکشند

اور کہاں زندگی کے یہ نغمے اور امید کی یہ لہریں :

سفینہ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزاروں موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

اور زندگی کا یہ بصیرت افروز اور تعمیری نظریہ :

تو اسے پیمانہ امروز فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اقبال کے نزدیک زندگی کوئی ساکن اور جامد چیز نہیں - بلکہ ہمیشہ رواں دواں ، متحرک ، مضطرب اور ارتقا پذیر ہے- زندگی ازل سے ابد تک ایک سیل بے پناہ ، اول سے آخر تک ایک چشمہ جاری اور ابتدا سے انتہا تک ایک بحر بیکراں ہے - یہ بن نہیں چکی بلکہ بن رہی ہے اور بنتی

رہے گی ۔ مو الید ثلاثہ سفر زندگی کے مختلف مرحلے ہیں اور صبح و شام ، روز و شب اس کے بڑھتے ہوئے قدم ہیں ۔ آفتاب و ماہتاب ، ستارے اور سیارے زمین و آسمان ارواح و عناصر غرض کائنات کا ذرہ ذرہ زندگی کی برق رفتاری کا مظہر ہے ۔ اس طرح زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی جاتی ہے ۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :

ہر شے مسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

زندگی کا یہ حرکی تصور اقبال کی سب سے بڑی خصوصیت ہے ۔ اقبال سب سے پہلا شاعر ہے جس نے زندگی کی یہ حقیقت واشگاف کی :

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

یہ زندگی ہی تو ہے جو سینۂ سنگ میں شرر بن کر پھوٹتی ہے اور محفل نباتات میں رنگ و بو بن کر بہتی ہے اور قلب انسانی میں امنگیں اور ارمان بن کر دھڑکتی ہے ۔

سب سے پہلے اقبال کی عمیق نظر زندگی کی اس متحرک وحدت پر پڑی اور اس نے یہ دقیق لیکن مبنی بر حقیقت دعویٰ کر کے علمی دنیا کو چونکا دیا ۔ کہ ع

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

لیکن وہ ورڈز ورتھ کی طرح عالم فطرت میں انسان کو مدغم نہیں کر دیتا ۔ اس کے ہاں انسان اشرف المخلوقات کی بلندیوں سے شیزہ و گل کی پستی پر کبھی نہیں آترتا اور کائنات کا یہ خلاصہ اور زندگی کا یہ نچوڑ سمٹ سمٹا کر محض ایک چیز بن کر نہیں رہ جاتا بلکہ اس کے برعکس وہ انسان کو تمام مظاہر زندگی سے برتر ، ممتاز اور متصرف قرار دیتا ہے کیونکہ انسان خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات میں نظم ، حسن اور ترتیب پیدا کرتا ہے اور خدا کی بخشی ہوئی تخلیقی اور تعمیری قوتوں کو بروئے کار لا کر اس دنیا کو حسین تر اور جمیل تر بنا دیتا ہے ۔

چنانچہ محاورہ خدا و انسان میں اقبال نے اسی نمایاں حیثیت کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے :

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

ان حقائق کی روشنی میں کیا یہ دعویٰ درست نہیں کہ زندگی کے ایسے مبصر اور کائنات کو اس عمیق نظر سے دیکھنے والے صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں - جیسا کہ اس نے خود کہا ہے :

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دوسری حیثیت شاعرِ اسلام

فلسفہ اقبال کا بنیادی اور مرکزی خیال نظریہ خودی ہے جس طرح قائدِ اعظم کے نام کے ساتھ پاکستان کا نام زبان پر آتا ہے - اسی طرح اقبال اور خودی کا ذکر لازم و ملزوم ہیں - حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے ذات باری تعالیٰ ، کائنات اور انسان کے جو مقامات متعین کیے ہیں - اقبال نے اپنے فلسفہ' خودی میں انہی مقامات کی تشریح کی ہے - چنانچہ وہ تمثیل پیش کرتا ہے :

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن
عالم ایں شمشیر را سنگ فسن

یعنی انسان زمین پر خدا کا نائب ، خلیفہ یا امین ہے - اسے شمشیر کہا گیا ہے - کائنات ، آئینِ الٰہی کے نفاذ کا محل ہے اور انسانی شخصیت خودی کی نشو و نما اور ارتقا کے لیے ایک سازگار ماحول بھی - اسے سنگِ فساں سے تشبیہ دی گئی ہے - چونکہ انسانی خلقت کا مقصد اعلیٰ صرف قانون الٰہی کا نفاذ ہے اور انسان اس مقصد کے لیے حق تعالیٰ کا

آلۂ کار ہے ۔ اس لیے شمشیر زن حقیقت میں حق تعالیٰ ہے اور آیہ شریفہ کا یہی مطلب ہے ۔ نفاذِ حکم کے لیے نہایت ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو صفاتِ باری تعالیٰ سے متصف کرے ۔ آیہ کریمہ صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ سے بھی یہی مقصود ہے اور حدیث تخلقوا باخلاق اللہ سے بھی یہی مراد ہے ۔ اقبال کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اسلامی عقائد خارجی اثرات سے یکسر پاک ہو جائیں ۔ اس لیے انھوں نے عجمی تصوف پر ضرب کاری لگائی ۔

تصوف پر واحدانیت کا اثر ہو یا نہ ہو جیسا کہ جرمن مفکر وان کریمر کا خیال ہے اور بدھازم کی چھاپ بھی ہو یا نہ ہو ۔ جیسا کہ ہارن کا خیال ہے لیکن اس پر نیوپلیٹونزم یعنی افلاطونیت جدیدہ کا اثر تاریخی شواہد سے مسلم ہے ۔ اس لیے اقبال نے افلاطون کے فلسفہ گوسفندی اور حافظ کی خواب آور شاعری پر بڑے زور کے حملے کیے ہیں چنانچہ اسرار و رموز میں افلاطون کے متعلق صاف صاف کہتا ہے :

آہوش بی بہرہ از لطف خرام
لذتِ رفتار بر کبکش حرام
شبنمش از طاقت رم بے نصیب
طائرش را سینہ از دم بے نصیب
ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش
از طپیدن بے خبر پروانہ اش

حقیقت یہ ہے کہ اقبال جہاد کا پیمبر ہے اور یہ لوگ پستی، بے عملی اور بے اعتدالی کے خطیب ہیں ۔ وہ چنگ و رباب کی شاعری کو قوموں کے حق میں سمِ قاتل سمجھتا ہے ۔ کیونکہ اس سے بادشاہ محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ تو پیدا ہو سکتے ہیں لیکن طارق و خالد، محمد بن قاسم اور سلطان ٹیپو ایسے مجاہد ہرگز پیدا نہیں ہو سکتے ۔ چنانچہ کہتا ہے :

من آں علم و ہنر را با پرکاہے نے گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

اس سلسلے میں اقبال نے سیاست مغربی کا راز بھی طشت از بام کیا ہے جو مذہب و سیاست میں ایک حد فاصل قائم کرتی ہے ۔

اقبال نے بتایا کہ اسلام میں سیاست مذہب سے علیحدہ نہیں ، بلکہ مذہب ہی کا ایک شعبہ ہے ۔ بلکہ مذہب کو سیاست سے جدا کرنے کے نتائج بہت خطرناک ہوتے ہیں : ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وہ جنیدی اور اردشیری کو ایک ہی مردِ مومن کی ذات میں مجتمع دیکھنا چاہتا ہے اور مذہب و سیاست کی دوئی کو چشمِ تہذیب کی بے بصیری قرار دیتا ہے ۔

سب سے بڑی دلیل جس کی بنا پر ہم آسے شاعر اسلام کہتے ہیں یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو اسلامی اخوت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اہلِ مغرب نے عقیدہ وطنیت کی تلقین کچھ اس انداز سے کی کہ اقوامِ مشرق آن کے فریب میں آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں اور رشتہ وحدت جو و اعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا سے عبارت ہے ، ٹوٹ کر رہ گیا ۔ قوموں کو جغرافیائی تصورات کے حدود میں مقید کر کے اسلامی جذبہ اخوت سلب کر لیا گیا ۔ اور صیادان مغرب کو ان پراگندہ اقوام کا شکار کرنا آسان ہو گیا ۔ اقبال نے اہلِ مغرب کے اس دام کو توڑا اور ڈنکے کی چوٹ کہا کہ اسلام زمین پرستی نہیں خدا پرستی سکھاتا ہے ۔ ایک ایرانی مسلمان کو دارا و جمشید کی اولاد یا وادیٔ الوند میں پیدا ہونے پر فخر نہیں کرنا چاہیے ۔ بلکہ دین اسلام کی قدر مشترک یعنی کلمہ توحید اس کا سرمایۂ افتخار ہونا چاہیے ، جو ہندی و پاکستانی ، افغانی و ایرانی ، رومی و شامی اور عربی و مصری مسلمان کا اصولِ حیات ہے ۔ اقبال نے اسلامی اخوت کا ساز اس جوش و خروش سے چھیڑا کہ مصری مسلمان کا دل ایک چینی مسلمان کے دل کے ساتھ ساتھ دھڑکنے لگا ۔ چنانچہ یہ قطعہ اس جذبے کا ترجمان ہے :

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخ ساریم

تمیز رنگ و بو برما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

اور یہ شعر بھی اسی نظریے کا عکاس ہے :

غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

تیسری حیثیت شاعر انقلاب

انقلاب سے مراد وہ اساسی تغیرات ہیں جو جامعۂ انسانی کے اخلاق معاشرتی ، معاشی اور سیاسی حالات کو بہتر بنانے کے لئے بروئے کار لا جائیں ۔ تاکہ استعمار کی جگہ حریت ، استحصال کی جگہ استقلال اور نامنصفان اقدار کی جگہ منصفانہ اقدار لے لیں ۔ اس معنی میں بھی اقبال اسلام نشاۃ ثانیہ کا پیشرو ہے ۔ جو انسانی حریت و مساوات کا سرچشمہ ہے ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مفکرین اپنے افکار کے بیج قوموں کے اذہان میں بو دیتے ہیں ۔ جہاں وہ پرورش پاتے رہتے ہیں ۔ پھر سیاسی لیڈر انہی افکار پر اپنی تحریکوں کی بنیاد رکھ دیتے ہیں ۔ مثال کے طور پر انقلاب فرانس کے بانی والٹیر یا روبسپائر نہیں تھے بلکہ روسو تھا جس کی تحریرو نے لیڈروں کو اس کے لئے تیار کیا ۔ اسی طرح انقلاب روس کے بانی لینن یا ٹراٹسکی نہیں تھے ۔ بلکہ مارکس کی انقلابی تلقینات کی وہ چنگاریاں تھیں جو اس کی مشہور کتاب سرمایہ کے نام سے سلگ رہی تھیں ۔ اس معنی میں ہم اقبال کو آزاد وطن کا بانی قرار دے سکتے ہیں ۔ کیونکہ اس کے افکار نے ہند و پاکستان کی آزادی کے لئے زمین تیار کی ۔ سب سے پہلے اس نے غلامی کی مکروہ تصویر کھینچ کر قلوب کو اس سے متنفر کیا ۔ مثلاً :

آدم از بے بصری بندگئ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

پھر کہتا ہے :

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری

دوسری جگہ آزاد و غلام کا موازنہ اس طرح کیا ہے :

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہم دوش
وہ بندۂ آفاق ہے یہ خواجۂ آفاق

پھر خضرِ راہ میں غلامی اور آزادی کا فرق اس طرح بیان کیا ہے :

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

بلکہ ایک اور قدم آگے بڑھاتا ہے - اور مغربی جمہوریت کو بھی غلامی ہی کی ایک صورت قرار دیتا ہے :

دیو محکومی ہے جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

جمہوریت کے پردے میں بھی استبداد ہی کی ایک جھلک نظر آ جاتی ہے - چنانچہ کہتا ہے :

اگر تاج کئی جمہور پوشد
ہماں ہنگامہ‌ہا در انجمن است
نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نہ باشد کوہکن است

وہ اسلامی نظامِ حیات کو از سر نو نافذ کرنا چاہتا ہے اسی سرچشمے سے حقیقی آزادی و مساوات کے دریا بہتے ہیں اور اسی معنی میں وہ ایک انقلابی شاعر ہے - وہ اشتراکی عروج کو بھی ، جو آج دنیا میں مدعی مساوات انسانی ہے ، اسلام کے مکمل روحانی اور مادی انقلاب کی طرف دعوت دیتا ہے - اور کہتا ہے :

بگذر از لا جانبِ الا خرام

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس جامع ، مادی اور روحانی انقلاب کی دعوت پر صرف مادی انقلاب کے داعیوں کا ردِ عمل کیا ہے۔

شاعر مستقبل

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بعض مفکرین و مصلحین کے دل و دماغ اپنے معاصرین کے دل و دماغ کی نسبت بہت ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے ثمرات فکر و نظر معاصرین کی فہم و فراست سے بالاتر رہتے ہیں اور انہیں اس سطح تک پہنچنے کے لیے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے۔ ایسے مفکرین یا مصلحین کے متعلق یہ کہنا بجا ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوئے ہیں۔ اقبال کو بھی اس حقیقت کا احساس ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نوائے شاعرِ فرداستم
اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بربست و چشم ما کشاد

اقبال سے پہلے غالب نے بھی اس قسم کی پیش گوئی کی تھی۔

ع
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

یعنی میری سوسائٹی ، میرے افکار کی سطح تک نہیں پہنچ سکی۔ یہ خواب مستقبل میں شرمندہ تعبیر ہوگا۔ چنانچہ یہ پیشگوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ غالب کے معاشرے کی کور ذوقی سے انیسویں صدی میں ذوق ایسے شاعروں کو اس کا مدِ مقابل سمجھ لیا گیا۔ اس غالب کو آج بیسویں صدی میں دوسری زندگی ملی ہے۔ اقبال کو بھی اس قسم کے کوتاہ بینوں سے گلہ ہے جو آسے صرف شاعر سمجھتے ہیں اور اس کے پیام عالمگیر سے بے بہرہ ہیں۔ جس پر اس کی عظمت جاودانی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

آشنائے من ز من بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت

کم نظر بے تابی جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید
من شکوہ خسروی او را دہم
تخت کسریٰ زیر پائے او نہم
او حدیث دلبری خواہد ز من
رنگ آب شاعری خواہد ز من

آنے والے واقعات کا عکس اس صفائی سے اس کے ذہن پر پڑتا ہے کہ
وہ آئینہ حال میں عکس مستقبل دیکھ لیتا ہے اور پیغمبرانہ انداز میں
پیش گوئی کرتا ہے :

دیکھ لینا سطوت رفتار دریا کا مآل
امواج مضطر ہی اُسے زنجیر پا ہو جائے گی
نالہ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خون گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اقوام مشرق کی بیداری اور استعمار مغرب سے آزادی کی کامیاب
تحریکیں جو آج ہمارے سامنے سرخرو ہوئی ہیں اُن کی ایک جھلک شاعر
کی چشم بصیرت نے بہت پہلے دیکھ لی تھی -

اسی طرح مغرب کے تہذیب و تمدن کی نامنصفانہ قدروں کی شکست
بھی آئندہ نسلیں دیکھ لیں گی اور شاعر کا یہ خواب بھی کہ :

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

ایک نہ ایک دن شرمندۂ تعبیر ہو کر رہے گا - اس لیے ہم بلاخوف
تردد کہہ سکتے ہیں کہ اقبال ماضی کا نقاد حال کا مبصر اور مستقبل کا
نامبر ہے - وہ ایک بڑا مفکر بہت بڑا مصلح اور ایک بہت بڑا محب

انسانیت ہے ۔ ضرورت ہے کہ دنیا اس کے پیغام عالمگیر کو سمجھے اور شاعر کے مشورے پر عمل کرے کہ :

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے'

* * *

۱ - مغز و مزہ (مقالات) آغا صادق ، مکتبہ آغا صادق شارع نجم الدین ، کوئٹہ ، ۱۹۶۹ء ، ص ۷۷ تا ۹۱ ۔

پروفیسر آغا صادق حسین

انسان کامل اقبال کی نظر میں

اقبال اس صدی کا مفکر اعظم ، نباضِ فطرت اور مبصرِ حیات ہے۔ اس نے اپنے فلسفیانہ افکار سے عہدِ حاضر کے اذہان کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے اور چونکہ اس کا ذریعہ اظہارِ خیال شعر ہے اس لیے اس کے بلند پایہ خیالات شعر کے سانچے میں ڈھل کر دلنشیں ، دلآویز اور مؤثر ہو گئے ہیں اور چونکہ وہ حیات کائنات اور خصوصاً شاہکارِ فطرت یعنی انسان کے متعلق واضح اور مربوط نظامِ فکر رکھتا ہے اس لیے اس موضوع پر اس کے افکار کا مطالعہ معلومات افزا اور دلچسپی سے خالی نہیں۔ چنانچہ انسان کامل کے متعلق اس کے فلسفے کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ اس کے انسان کامل کا نظریہ یورپ کے فلسفیوں خصوصاً مشہور جرمن فلسفی نٹشے کے نظریے پر مبنی یا اس سے ماخوذ ہے۔ لیکن گہری نظر اور دقیق مطالعے سے یہ حقیقت قطعی دلائل سے ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ مماثلت یا مشابہت بالکل سطحی سی ہے اور اقبال انسان کامل کے متعلق بذاتِ خود ایک مخصوص فلسفے کا موجد اور بانی ہے۔ البتہ یہ اصول مسلمہ ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ کوئی مجدد فن اپنے پیشہ وروں کے ثمرات دل و دماغ کو جذب کیے بغیر افکار کی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اقبال بھی اپنے پیشروؤں کے خیالات سے ناآشنا نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن اس نے انھیں جذب کرنے کے بعد اپنایا۔ غیر صالح عناصر کو رد کیا اور صالح عناصر کا اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ اس لیے اقبال کی طبعزادگی یا (ORIGINALITY) میں کوئی کلام نہیں۔ جن افکار سے اقبال کے خیالات کی مشابہت پائی جاتی ہے ان میں نیٹشے کے فوق البشر اور اقبال کے مردِ کامل کا

تصور بھی ہے - لیکن دونوں کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زمین آسمان کا فرق ہے - نیٹشے کا فوق البشر یعنی مستقبل کا اعلیٰ انسان ، ظالم ، جابر ، خود غرض اور حریص۔ اقتدار شخصیت ہے- وہ رحم ، اخلاق ، عفو ، احسان وغیرہ ایسے خصائل حسنہ سے قطعاً معرا ہے- لیکن اقبال کے مردِ کامل کے عناصر چہار گانہ میں قہاری جبروت کے علاوہ قدوسی و غفاری ایسی صفات بھی ہیں - چنانچہ وہ کہتا ہے :

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اس کے برعکس نیٹشے کا فوق البشر کسی اخلاقی قانون کا پابند نہیں- اس کے عمل کا معیار اندھا دھند تصرف اور تغلب ہے- علاوہ ازیں وہ اس کی تخلیق کو حیاتیاتی ذرائع پر منحصر سمجھتا ہے - یعنی مستقبل کا یہ انسان بہتر سے بہتر نسل کشی کا ثمرہ ہو گا- اس کے نزدیک یہ ہو گا انسانیت کا نجات دہندہ- لیکن اقبال کا مرد مومن یا انسان کامل اجتماعی اختیار سے افضل ہے - صفات جلالی اور جمالی دونوں کا حامل ہے اس میں فقر و شاہی اور ناز و نیاز پہلو بہ پہلو موجود ہیں- اس کی سیرت یہ ہے :

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولٰی صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادائے دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اقبال ورڈز ورتھ کی طرح انسان کو عالمِ فطرت میں مدغم نہیں کر دیتا- بلکہ اس کے ہاں وہ ہمیشہ اشرف المخلوقات کی بلندی پر فائز رہتا ہے اور کبھی سبزہ و گل کی پستیوں پر نہیں اترتا اور زندگی کا یہ

نچوڑ اور کائنات کا خلاصہ یعنی انسان کامل سمٹ سمٹا کر محض ایک چیز نہیں بن جاتا ، بلکہ اس کے برعکس وہ اسے تمام مظاہر زندگی سے برتر ، ممتاز اور متصرف قرار دیتا ہے کیونکہ وہ خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات میں نظم و حسن اور ترتیب پیدا کرتا ہے اور خدا کی بخشی ہوئی تخلیقی صلاحیتوں اور تعمیری قوتوں کو بروئے کار لا کر اس دنیا کو حسین تر اور جمیل تر بنا دیتا ہے۔

اپنی مشہور نظم محاورہ خدا و انسان میں وہ انسان کی ایسی نمایاں خصوصیت کی طرف لطیف اشارہ کرتا ہے :

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اقبال تسخیر فطرت کو انسان کامل کا وظیفہ حیات قرار دیتا ہے اور علم اشیاء سے متصف ہونا اس کا فرض عین سمجھتا ہے کیونکہ علم اشیاء ہی سے تسخیر فطرت کی مہم سر ہو سکتی ہے اور یہی خلافت الٰہیہ کی شرطِ اول ہے۔ اقبال کے نزدیک تسخیر فطرت ہی انسان کو نیابت الٰہیہ کا مستحق اور (و لقد کرمنا بنی آدم) - (یعنی بے شک ہم نے انسان کو برتری بخشی) کا مصداق بناتی ہے وہ بار بار انسان کامل کی تخلیقی قوتوں پر زور دیتا ہے - کیونکہ ان کے بغیر انسان اپنے مقام سے گر جاتا ہے - اقبال اسلام کے مثالی انسان کامل کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے کہ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ یا نائب ہے - وہ خدا کے قوانین عالمگیر زمین پر نافذ کرتا ہے - اس کی صفات عالیہ سے اپنے آپ کو متصف کرتا ہے اور اس کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگتا ہے - اس لیے اس کے حق میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی سی صفات اپنے اندر پیدا کرے - اقبال کے نزدیک انسان کامل ایک مجبور اور بے بس ذات یا ایک منفی حقیقت نہیں -

بلکہ وہ معین اقدار کا حامل اور مثبت صفات کا امین ہے۔ وہ بحکم خدا فاعل مختار، کائنات میں متصرف اور خدا کی تخلیقی قوتوں کا مظہر ہے۔ کائنات کی گتھیوں کو سلجھانا اس کا لائحہ عمل ہے اور عناصر کی باگ ڈور سنبھالنا اس کا پیدائشی حق ہے۔ ہوا کے جھونکے اس کے فراش، سورج کی کرنیں، اس کے باورچی اور بجلی کی لہریں اس کی پیغامبر ہیں۔ فطرت کی قوتوں کی تسخیر اس کی امتیازی شان اور آب و خاک و باد و آتش سے خدمت لینا اور اس کا لازمہ حیات ہے۔

تسخیر کائنات خدا کے قانون کی اطاعت ہے بلکہ اس کے لیے اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنا عبادت ہے۔ عناصر پر اپنی فوقیت اور اپنے خدا کی حاکمیت مطلقہ کا اقرار انسان کامل کا اصول حیات ہے۔ اقبال نے انسان کامل کی خودی یعنی شخصیت کی ترتیب کے جو تین مراحل بیان کیے ہیں ان کی اصل یہ ہے۔ مرحلہ اول اطاعت ہے۔ یعنی اس دستور العمل کی اطاعت جو رسول مقبول صلعم کے ذریعے امت مسلمہ کو دیا گیا ہے۔ اس مرحلے پر انسان کامل قرآن مجید کی اس آیت کریمہ کا مصداق ہوتا ہے:

اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم۔

"یعنی اللہ اس کے رسول اور تم میں سے حاکم ہو اس کی اطاعت کرے۔"

چنانچہ اقبال کہتا ہے:

تابع حق دیدنش نادیدنش

یعنی اس کا دیکھنا نہ دیکھنا، کھانا پینا، سننا غرض سب کچھ اس کے تابع ہوتا ہے۔

اسی جذبۂ اطاعت سے جذبۂ قربانی پیدا ہوتا ہے۔ اسی جذبہ کے زیر اثر خلیل اللہ اپنے لخت جگر کے گلے پر چھری رکھ دیتے ہیں اور اسی جذبہ کے تحت سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی جان و مال، اولاد اور اعزہ کی قربانی پیش کرتے ہیں اور یہ دونوں

انسان کامل کے مثالی کردار ہیں - مرحلہ دوم ضبط نفس ہے - یہ وہ مرحلہ ہے جب کہ مرد مومن ، خوف دنیا ، خوف مرگ ، اور خوف آلام زمین و آسمان پر غالب آ جاتا ہے اور حب مال ، حب عیال اور حب جاہ کو زیر کر لیتا ہے - یہاں بھی اقبال توحید میں پناہ ڈھونڈتا ہے :

تا عصائے لا الہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بند زن و اولاد شد

اب رہا یہ امر کہ ضبط نفس کس طرح کیا جاتا ہے - تو اقبال تعلیمات قرآن کی روشنی میں فرائض کی بجا آوری مثلاً نماز ، روزہ ، حج ، زکوۃ وغیرہ کو اس کا ذریعہ قرار دیتا ہے - مرحلہ سوم نیابت و خلافت الٰہیہ کا مرحلہ ہے - جب انسان کامل پہلے دو مرحلوں سے گزر جاتا ہے تو اس مقام جلیل پر فائز ہوجاتا ہے - جس کا اظہار اقبال اس طرح کرتا ہے :

نائب حق ہمچو جان عالم است
ہستیٔ او ظل اسم اعظم است
از رموز جز و کل آگہ شود
در جہاں قائم با مراللہ شود
پختہ سازد فطرت ہر خام را
از حرم بیروں کند اصنام را

یہ ہے اقبال کے انسان کامل کا ایک نمونہ -[1]

* * *

۱ - مغز و مزہ (مقالات) آغا صادق ، مکتبہ آغا صادق ، شارع نجم الدین ، کوئٹہ ، ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۷ تا ۲۳ -

پروفیسر آغا صادق حسین

اقبال ایک فن کار کی حیثیت سے

شاعر مشرق حکیم الامت ترجمان حقیقت حضرت علامہ اقبال ہر لحاظ سے ایک جامع کمالات شخصیت تھے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بالغ نظر مفکر ، ایک بلند پایہ سیاسی مدبر ایک روشن خیال قومی رہنما اور زندگی کے ایک زبردست نقاد تھے اور اگر بالفرض وہ شاعر نہ ہوتے تو بھی ایک عالم اور مبصر حیات کی حیثیت سے آن کا نام تاریخ کے صفحات پر ثبت رہتا ۔ لیکن ان کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کا سب سے بڑا راز ان کی شاعرانہ عظمت اوز آن کا سحر پرداز فن ہے ۔ یقیناً یہ ان کے کلام کی شعریت اور کمال فن کا معجزہ ہے کہ ان کے عصر آفرین کلام اور ہنگامہ پرور پیغام نے قوم کے ذہن میں رسوخ حاصل کیا اور آن کی دقیق حکمت اور عمیق فلسفہ قالب شعر میں ڈھل کر مؤثر دلآویز اور دل نشین ہو گیا ۔ بلاشبہ یہ ان کی فنی چابکدستی کا کرشمہ ہے کہ وہ کتابوں کی دنیا سے نکل کر نہ صرف خواص کے دماغوں میں بلکہ عوام کے دلوں اور روحوں میں سما گئے ۔ ان کی فن کارانہ عظمت پر تبصرہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم فن کی حدود متعین کر لیں تاکہ ان کی روشنی میں آن کے فنی کمالات کا جائزہ لیا جا سکے ۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فن کا بنیادی عمل متاثر کرتا ہے ۔ موسیقی ہو یا رقص ، مصوری ہو یا شعر تمام فنونِ لطیفہ قلوب انسانی پر گہرا اثر پیدا کرنے کے زبردست ذرائع ہیں ۔ یوں تو سب فنون لطیفہ انسانی جذبات کو متحرک کرتے ہیں لیکن جذبات کو برانگیختہ کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ شعر ہے ۔ علم اور فن کا بنیادی فرق یہ ہے کم علم صرف یقین لاتا ہے ، دماغ کو روشن کرتا ہے اور خیر و شر کی تمیز پیدا کرتا ہے ۔ لیکن شعر دل کی گہرائیوں تک آترتا ہے اور روح کو جھنجوڑتا ہے اور

عمل اور جد و جہد پر ابھارتا ہے ۔ چنانچہ اس نازک فرق کو علامہ اقبال نے ایک شعر میں اس طرح ظاہر کیا ہے :

علم اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر میگرد چو سوز از دل گرفت

شعر کے اثر کے بارے میں تو یہ بات مانی ہوئی ہے کہ از دل خیزد بر دل ریزد ۔ لیکن اثر پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ معنی اور الفاظ کا چولی دامن کا ساتھ رہے ۔ خیال جس قسم کا ہو اس کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب ہو ۔ گہرے دقیق اور فلسفیانہ خیال کے لیے الفاظ بھی پر شوکت ہوں اور تراکیب بھی باوقار ، مناظر قدرت کی تصویر کشی کے لیے الفاظ بھی ہلکے پھلکے ہوں اور ترکیبیں بھی سادہ اور رواں ۔ جب ہم کلام اقبال کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اقبال نے کبھی اس فنی اصول سے انحراف نہیں کیا ۔ انہیں انتخاب الفاظ کا اعلی درجے کا سلیقہ اور مضمون اور زبان کی ہم آہنگی کا گہرا شعور ہے ۔ ان کے کلام میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں ۔ ہم اختصار کے پیش نظر تین مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں ۔ مرزا غالب کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے جو سنجیدہ اور باوقار لہجہ اختیار کیا ہے وہ ان اشعار سے ظاہر ہے :

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر
شاہد مضمون تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچہ دلی گل شیراز پر
آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لیکن اس کے برعکس ماہ نو کی تصویر کشی کرتے وقت زبان اور لب و لہجہ نرم پڑ گیا ہے ۔ اور ہلکی پھلکی تشبیہات سے تخلیق حسن کا کام لیا گیا ہے ۔ مثلاً :

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب
نشتر قدرت نے کیا کھولی ہے فصد آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروس شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی

بلکہ ایک ہی نظم کے مختلف حصوں میں مضمون کی ماہیت کے اعتبار سے لب و لہجے کا فرق محسوس ہوتا ہے اس کی مثال ان کی مشہور نظم ''۔۔۔گود میں بلی دیکھ کر'' میں ملتی ہے چنانچہ پہلے حصے میں ملائمت اور ہلکا پھلکا انداز ہے۔ ملاحظہ ہو:

مارتی ہے انہیں پونچھوں سے عجب ناز ہے یہ
چڑ ہے یا غصہ ہے یا پیار کا انداز ہے یہ
شوخ تو ہو گی تو گودی سے اتاریں گے تجھے
گر گیا پھول جو سینے کا تو ماریں گے تجھے

لیکن دوسرے حصے میں پرشکوہ بھاری بھر کم طرز پیدا ہو گیا ہے کیونکہ کائنات اور عشق کا موضوع اسی کا طالب ہے:

شیشۂ دہر میں مانند مئے ناب ہے عشق
روح خورشید ہے، خون رگ مہتاب ہے عشق
کہیں سامان مسرت کہیں ساز غم ہے
کہیں گوہر ہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے

ایک فطری شاعر اثر آفرینی کے جن حربوں سے کام لیتا ہے۔ ان میں تخیل، محاکات، ترنم اور جذبات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ تخیل سے مراد وہ ذہنی قوت ہے جو حواس خمسہ سے حاصل شدہ ذخیرۂ معلومات کو از سر نو ترتیب دے کر نئی صورت میں پیش کرتی ہے۔ مثلاً چشم ظاہر سے دیکھتے ہوئے مناظر کو شاعر چشم بصیرت سے دوبارہ دیکھتا ہے اور گوش ظاہر سے سوئی ہوئی صداؤں کو گوش ہوش سے پھر سنتا ہے۔ گویا اس کا

ماضی حال کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جو لذت اس مشاہدے اور سماعت سے حاصل ہوتی ہے وہ اسے اظہار و ابلاغ پر اکساتی ہے اور اس طرح وہ مناسب الفاظ کے ذریعے اس کیفیت میں دوسروں کو بھی شریک کر لیتا ہے۔ محاکات کا مطلب یہ ہے کہ شاعر الفاظ کے ذریعے واقعات و مظاہر کی اس طرح تصویر کشی کرتا ہے کہ ہو بہو وہی تصویر سامعین یا قارئین کے پیش نظر ہو جاتی ہے جو شاعر نے دیکھی ہوتی ہے۔ ترنم کا مفہوم یہ ہے کہ جن الفاظ کے ذریعے شاعر اظہار خیال کرتا ہے۔ وہ بذات خود خوش آہنگ اور لذت بخش ہوتے ہیں۔ چونکہ الفاظ قطع نظر معنی کے اپنی صوتی اقدار بھی رکھتے ہیں اس لیے انہیں اگر سلیقہ سے ترتیب دیا جائے تو سامع ان سے محظوظ ہوتا ہے اور جذبات سے مراد یہ ہے کہ شاعر کو جب کسی حقیقت کا شدید احساس ہوتا ہے تو وہ قارئین یا سامعین کو بھی اسی شدت سے اس حقیقت کا احساس دلاتا ہے۔ گویا اپنی قادر الکلامی سے وہی جذبہ ان تک بھی منتقل کر دیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں کس خوبصورتی سے یہ عناصر چہار گانہ سموئے گئے ہیں اور ان کا عالمگیر پیام حیات شعریت کے کس کس سانچے میں ڈھلا ہے اس لطیف حقیقت کو کہ پروردگار عالم کے نزدیک بندوں کی پشیمانی گناہ خود اطاعت و بندگی سے بھی زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنی ابتدائی شاعری میں ایسے حسین پیرائے میں ادا کیا ہے کہ اس وقت کے کہنہ مشق اساتذہ سے بھی اپنی فن کاری کا لوہا منوا لیا۔ وہ مشہور شعر جو اقبال کی شہرت کا سنگ بنیاد ہے:

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

یہ ایک اچھوتی تشبیہ یعنی پسینے کے قطروں کو موتی قرار دینے کا کرشمہ نہیں۔ بلکہ ایک قوی تخیل کا اعجاز ہے۔ جس کی بدولت ایک حسین مستقبل نہ صرف شاعر کے پیش نظر ہو گیا۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ ہمیں بھی اس خوبصورت دنیا میں لے گیا۔

جگنو فطرت کا ایک درخشندہ گوہر تھا ہی شاعر کی قوت محاکات نے اسے چار چاند لگا دیے اور لطیف تشبیہات سے ایک حقیر جاندار کو پیار کے قابل بنا دیا۔ ملاحظہ ہو:

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

تنہائی کی آرزو شاعر ہوں یا غیر شاعر، اکثر لوگوں نے کی ہوگی۔ غالب نے بھی اسی تاثیر کے تحت کہا تھا:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم نفس کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

لیکن اس عالم تنہائی میں غالب کے ساتھ جانے پر شاید ہی کوئی رضامند ہو۔ اس کے برعکس اقبال نے خلوت کی آرزو کی ہے۔ اتنی دلفریب اور دلآویز ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ہم بھی وہاں پہنچ کر اس خلوت کو جلوت بنا دیں۔ جہاں:

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

کلام اقبال میں موسیقیت کے بھی ایسے نادر نمونے ملتے ہیں جنہیں دیکھ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان میں ترنم کا بھی گہرا شعور تھا۔ مفہوم اور معنی سے قطع نظر۔ انہیں سن کر سماعت لطف اندوز ہوتی ہے۔ ان اشعار میں نغمگی کس قدر وجد انگیز ہے:

دم زندگی رم زندگی غم زندگی سم زندگی
غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری
کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

ایک غزل کے دو شعر سنیے معنویت کے ساتھ سازوں کی جھنکار بھی شامل ہو گی:

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

اقبال کے یہاں جذبات کی دنیا میں تو ایک محشر بپا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل کا سوز و گداز صفحہ قرطاس پر امڈ آیا ہے اور کتاب کے اوراق دھڑکتے دل کی دھڑکن ہیں۔ ان اشعار میں اصلاحی اور تعمیری جذبے کا جوش و خروش محسوس کیجیے:

یا مسلماں را مدہ فرماں کہ جاں بر کف بنہ
یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں

یا چناں کن یا چنیں

اقبال کے یہاں ایجاز کا یہ عالم ہے کہ ایک ایک مصرعے میں ایسی لطیف حقیقتیں ادا ہو گئی ہیں جن کے متحمل دفتر بھی نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ع:

میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

اقبال کے ہاں خاص خاص علامتیں اور اشارات پائے جاتے ہیں۔ جن

سے ابلاغ حقیقت کا کام لیتے ہیں ۔ ان کی اپنی اختراع میں لالہ ، شاہین ، مرغ حرم وغیرہ بہت معروف ہیں ۔

ان حقائق کے پیش نظر بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نہ صرف مفکر، مدبر اور معلم ہیں بلکہ سحر طراز شاعر اور فن کار بھی ہیں ۔ ان کے افکار نے فن کا جامعہ پہنا ہے تو ان کا پیغام عصر آفرین بنا ہے اور برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ ان کی کامیاب فن کاری کا زندہ ثبوت ہے ۔[1]

* * *

---

۱ ۔ مغز و مزہ ، آغا صادق ، کوئٹہ ، ۱۹۶۹ء ، ص ۵۱ تا ۶۰

پروفیسر شمیم احمد

اقبال کا تصور خودی

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ جس کا تصور خدا پست ہوتا ہے اس کا تصور محبوب بھی پست ہوتا ہے مگر بیسویں صدی کی بڑی شاعری عموماً تشکیک سے پیدا ہوئی ہے جو اگر خدا کا انکار نہیں کرتی تو اس کا اقرار بھی نہیں کرتی۔ لہذا یہ طے کرنا مشکل امر ہے کہ شاعری میں جب تصور خدا ہی واضح نہ ہو گا تو اس کی بلندی اور پستی کا فیصلہ کیسے کیا جائے گا۔ بات یہ ہے کہ بڑی شاعری ہونے اور نہ ہونے کے مسئلہ سے دوچار ہوتی ہے اور یہی اس کے تشکیک کا سبب بنتی ہے۔ اسی لیے ایسی شاعری کا سفر خارج سے باطن کی طرف ہوتا ہے۔ وہ کائنات کے مسئلوں سے اپنی جانب سفر شروع کرتی ہے مگر بیسویں صدی میں اقبال واحد شاعر ہیں جو خدا کے بارے میں یقین سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں۔ اسی لیے اُن کی شاعری اپنی ذات سے خدا کی طرف سفر کرتی ہے اور اسی سفر کے شعور کو اقبال نے خودی کا نام دیا ہے۔

یہ بات تھوڑی سی وضاحت چاہتی ہے۔ اقبال بڑی حد تک فلسفۂ وحدت الوجود کے بڑے زبردست ناقد رہے ہیں۔ قدیم شاعری میں اس فلسفہ کے معنی تھے خدا وہ وجود واحد ہے جو مختلف و متضاد و تعینات میں ظاہر ہوا ہے۔ یعنی وہ احدیت سے تنزل کی طرف سفر کرتا ہے۔ چنانچہ تمام کائنات اس کی بزم اور یکتائی جمال سے منور ہے اور انسان اس کا ایسا راز ہے جس میں کائنات کے تمام مظاہر کمال ہم رنگی سے ظاہر ہوئے ہیں۔ لہذا حقیقت و مجاز ایک ہی حقیقت کا نام ہیں۔ مغرب نے چونکہ خدا سے تعلقات توڑ لیے ہیں اس لیے اس نے فلسفۂ ارتقاء کے ذریعے

حقیقت کائنات کو دریافت کرنے کی سعی کی ہے۔ اقبال چونکہ بنیادی طور پر مغربی فلسفے کے بڑے ذہین طالب علم رہے ہیں اسی لیے وہ حقیقت کائنات کے بڑے قائل تھے۔ اسی بنا پر وہ وحدت الوجود سے کنی کترا کر نکل جانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ کائنات انسان اور خدا کے درمیان باطل حقیقت یا بت خانہ کی مانند حائل ہے تاکہ وہ اسے تسخیر کر کے اپنی اصل سے مل جائے:

یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طلسم زمان و مکان توڑ کر

اسی لیے وہ کائنات کی تسخیر کے لیے انسانی جہد و عمل کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور اس کو خبردار کرتے ہیں:

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحر وجود میں گرداب

حقیقت کائنات کے اسی شعور کو اقبال نے خودی کا نام دیا ہے جو انسان سے خدا کی طرف سفر کرتے ہوئے تسخیر کائنات کے علم کا نام ہے۔ اب ذرا اس حقیر سی تشریح کے بعد اقبال کے وہ اشعار پڑھیے جو خودی پر ان کا اصل مقدمہ خیال کیے جاتے ہیں:

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے
خودی کا نشیمن تیرے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے
خودی شیر مولا، جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید
یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اقبال کا ساقی نامہ پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اقبال ہم میں اس شعور کو بیدار کرنا چاہتے ہیں جو تسخیر کائنات کو انسان کا سب سے بڑا فریضہ خیال کرے۔ جب انسان اس مقام پر پہنچ جائے گا تو وہ خدا سے ہم آہنگ ہو جائے گا اور اس کا کہا اللہ کا کہا اور اس کا کیا اللہ کا فرمان بن جائے گا۔ اس شعور کو اقبال نے ایک مصرعہ میں عجیب طریقے سے بیان کر دیا ہے:

گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

گویا اقبال کے نزدیک حقیقت کائنات کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان میں تسخیر کائنات کا شعور موجود ہو۔ خودی کا یہ تصور اقبال کے پورے کلام کو محیط کرتا ہے۔ خواہ وہ انسانی جدوجہد کی ترغیب ہو، یہ عمل و سخت کوشی کی تلقین، غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ ہو یا مغرب کے باطل نظام کے شکست و ریخت کی خواہش، مسلمانوں کی زبوں حالی کا مرثیہ ہو یا اسلام کی تعلیمات کا فلسفۂ عمل۔ ہر جگہ اقبال ایک ہی شعور و بیداری کا سبق پڑھاتے نظر آتے ہیں اور وہ ہے تسخیر عالم اور تسخیر کائنات۔ ان کو مغرب کے فلسفۂ ارتقاء سے اس لیے کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہے کہ ان کا فلسفۂ ارتقاء مغرب کی مخالف سمت سفر کرتا ہے۔ مغرب فلسفۂ ارتقاء سے جو نتیجہ نکالتا ہے وہ نفی اور الحاد ہے جب کہ اقبال کا فلسفۂ ارتقاء اثبات اور اقرار کی اس منزل تک لے جاتا ہے جہاں یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ کا بظاہر گستاخانہ مگر شوخ دعویٰ موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ اقبال کا یہ تصور خودی

صرف بال جبرئیل کی دو ایک نظموں یا اسرار خودی ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اُن کا یہ طرز فکر پوری فکر اقبال میں گہرائی تک موجود ہے اور میں اس شعور اور خودی کا سب سے بڑا مظہر ضرب کلیم کی مشہور نظم ''لا الہ الا اللہ'' کو سمجھتا ہوں ۔ جس میں اُن کی خودی کا فلسفہ وہ منزل حاصل کر لیتا ہے جہاں انسان اور خدا کے درمیان ہر رکاوٹ ، کائنات ، عالم اور دنیا کی ہر باطل قوت ایک نعرہ لا الہ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے ۔ اس نظم کے آخری مصرعوں کا یقین اور اثبات ایک ایسی قوت بن جاتا ہے جسے ہم اقبال کا تصور خودی بھی قرار دے سکتے ہیں اور شعور کی وہ منزل بھی جہاں اقبال مسلمانان عالم کو پہنچانا چاہتے تھے ۔ ان کے کلام کا بنیادی کرب اُن سوالات کی تلاش ہے ، جس سے وہ اپنی قوم کو اس شعور کا حامل بنا دینا چاہتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ یہ نظم ایسے تمام سوالات کو اُٹھاتی ہے جس سے ملت اسلامیہ دوچار ہے :

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکان کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

قدیم شاعری میں اکائی کا تصور تین بنیادوں پر قائم تھا ۔ انسان کا انسان سے تعلق ، انسان کا کائنات سے تعلق اور انسان کا اللہ سے تعلق ۔ یہ تینوں بنیادیں ایک کل کی صورت میں موجود تھیں اُن کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ انسان کا انسان سے تعلق صرف رشتہ' آدمیت ہی کی پہچان نہ تھا بلکہ محبوب کے تعلق سے اپنی حقیقت کو بھی متعین کرتا تھا ۔ اس طرح انسان کا کائنات سے تعلق صرف زمینی رشتوں کو قبول کرنے کا نام ہی نہیں تھا بلکہ تمام کائنات محبوب کی تماشا گاہ بھی تھی اور انسان کا خدا سے تعلق ان دونوں رشتوں کی معنویت کی تکمیل کرتا تھا

جہاں محبوب حقیقی اور محبوب مجازی ایک ہی نقطہ میں ڈھل جاتے تھے جہاں کائنات کی ہر شے معرفت کردگار کا وسیلہ بن جاتی تھی - اقبال کے یہاں اکائی کا وہ تصور موجود نہیں تھا - اسی لیے اُن کی شاعری میں پہلی بنیاد کا تصور ہی نہیں ملتا - دوسری بنیاد یعنی کائنات اُن کے لیے غیر بن جاتی ہے اور اس کو تسخیر کر لینے کی دعوت دے کر اس کو انسان کا حریف قرار دیتے ہیں - البتہ اُن کی شاعری میں تیسری دنیا مل جاتی ہے مگر وہ اُن کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بلکہ یقین و ایمان ہے ، جس کا نقطہ معراج حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات مبارک ہے -

اگر ہم کلام اقبال کو اس سطح پر دیکھیں تو وہ ہمیں مغرب سے بہت کچھ متفق ہوتے ہوئے بھی اس سے جداگانہ سفر کرتا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ مغرب کا بنیادی ادب انسان اور انسانی تعلقات ہی کا ادب ہے اور اس سے جب بلند ہوتا ہے تو حقیقت کائنات کے سوال سے اُلجھتا ہوا نظر آتا ہے - اقبال کے زمانے تک مغرب کا یہ ادب اپنے تمام امکانات پورے کر چکا تھا - لہذا اقبال مغرب کے انسان اور انسانی تعلقات کے ادب سے اس قدر غیر متاثر کیسے رہے - اس پر جتنا بھی غور کیجیے اتنی ہی حیرت بھی ہوتی ہے اور یہ سوال بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے - البتہ کائنات سے متعلق مغرب کے رویہ پر اقبال کا ردعمل فوراً سمجھ میں آ جاتا ہے -

اقبال کو یہ بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ مغرب کی ساری ترقی اور توانائی ، کائنات کو سمجھنے ، برتنے اور اس کو تسخیر کرنے سے ظہور میں آتی ہے اور مغرب اقبال کا حریف بھی ہے اور وہ نشانہ بھی جس کا انجام تباہی ہے - اس لیے اقبال اپنی قوم میں جس شعور کو سب سے زیادہ بیدار کرنا چاہتے ہیں وہ ہے تسخیر کائنات کا عمل جو انہیں مغرب کی توانائی ، ترقی اور آگہی کا وارث بھی بنا سکتی ہے اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی جب کہ اقبال کو یہ پکا یقین تھا کہ مغرب کے پاس تیسری بنیاد ہی موجود نہیں ہے جو مسلمانوں کو ایک کامل قوت اور تصور حیات کا حامل بناتی ہے - گویا اب اقبال کے سامنے جو بنیادی سوال تھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس کا شعور کیسے دلایا جائے کہ وہ تسخیر کائنات

میں مغرب سے آگے جا سکتے ہیں اس کے لیے جہاں مسلمانوں کے ماضی کی فتوحات اور مغرب کے معلم ہونے کا دعویٰ تھا وہاں اس ذات مقدس سے اس کا والہانہ شغف تھا جسے اقبال انسان اور اللہ کے درمیان واحد وسیلہ سمجھتے تھے چنانچہ اقبال کی خودی کا تصور اس شعور سے اکتساب نور کرتا ہے جو ایک طرف حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذاتِ مبارک کو اپنا اول و آخر رہنما سمجھتا ہے تو دوسری طرف وہ اس نور سے رشتہ پیدا کرتا ہے جس کا ذکر قرآن مجید کے سورۃ النور میں آیا ہے اور جس کی حقیقت پر اقبال کا ایک خطبہ بھی موجود ہے یعنی حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو آسمانوں اور زمین کا نور فرمایا ہے اور اس نور کی مثال یوں دی ہے جیسے طاقچہ میں ایک چراغ ہو اور وہ چراغ ایک قندیل کی مانند ہو جس کا سینہ موتی کی طرح چمکتے ہوئے ستارے کی مانند ہو اور وہ چراغ زیتون کے ایسے مبارک درخت سے روشن ہو جو نہ شرق ہے نہ غربی اور قریب ہے کہ وہ جل اٹھے خواہ اسے آگ نہ دکھائی جائے اور جب اسے تعلیم نبوت سے روشن کر لیا جائے تو وہ فوراً نور علیٰ نور کا حامل ہو جائے۔

اب اس تشریح کی روشنی میں خودی وہ نور ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان سربستہ راز تھا جسے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ظاہر کر دیا ہے اور یہ نور نورِ حقیقی سے جا ملنا چاہتا ہے جس کے درمیان کائنات حائل ہے۔ لہذا اس کائنات کو تسخیر کیے بغیر یہ ممکن نہیں اور یہی منشائے الٰہی ہے۔ اقبال کا تصور خودی دراصل انسان کا وہ ازلی اور ابدی سفر ہے جو اللہ کی طرف جاری ہے اور کائنات اس سفر کی ایک منزل ہے جس کا شعور حاصل کرنا ہی مبدءِ آدم اور نبیؐ آخر الزماں کے ظہور کا سبب تھا اور اسی کی طرف اقبال بار بار توجہ دلاتے ہیں۔ ان کا سارا اضطراب مسلمانوں کے جمود اور سکون کے خلاف نبرد آزما ہو کر اسی شعور کو بیدار کرنے میں ڈھل جاتا ہے:

کچھ اور چیز ہے شاید تیری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک، فقر و رہبانی

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

———

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

(تحریر : ۹ نومبر ۱۹۷۷ء)

* * *

میر مٹھا خان مری

عزیز مگسی کی شاعری پر علامہ اقبال کے تاثرات

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے متعلق ایک الہامی پیش گوئی کی ہے :

پس از من شعر من خوانند و دریا بندد می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

علامہ اقبال کا یہ دعویٰ کہ انہوں نے شعر و سخن کے ذریعے دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے کوئی شاعرانہ تعلی یا مبالغہ آرائی نہیں بلکہ یہ امر واقعہ ہے کہ شاعر مشرق نے اپنے انقلابی پیغام کے ذریعے قدیم اور فرسودہ انداز فکر کی بنیادیں ہلا ڈالیں اور اس کی جگہ ایک نئے صحت مند اور توانا نظام فکر کی بنیاد رکھ دی ۔

علامہ اقبال کی انقلاب انگیز شاعری نے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں ایک نیا جوش عزم اور ولولہ پیدا کیا جس کے نتیجہ میں پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے اذہان میں بیت الحرام کے مرکزی نکتہ پر متحد ہونے کا گہرا شعور اور احساس پیدا کیا ۔

شاعر مشرق کے کلام کی ہمہ گیری کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ ان کی شاعری نے بلوچستان جیسے دور افتادہ اور پسماندہ صوبہ پر بھی گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے ۔

نوابزادہ یوسف علی خان عزیز مگسی کی شاعری کا اگر بنظر غور مطالعہ کیا جائے تو اس کے افکار، خیالات اور اسلوب بیان پر شاعر مشرق کے افکار کی چھاپ صاف دکھائی دے گی۔ عزیز مگسی ایک سیاسی رہنما تھے اور سیاسی مقصد کے لیے ادب کی اہمیت اور افادیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے جدوجہد آزادی کے سلسلے میں برصغیر کے سربرآوردہ سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ صحافی، ادیب، شاعر اور دانشوروں سے بھی براہ راست روابط استوار کیے۔ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر جیسے مشاہیر عصر سے ان کے گہرے روابط اور قریبی مراسم تھے۔ مولانا ظفر علی خان سے تو عزیز مگسی کے بے حد مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے عزیز مگسی کے متعلق اپنے ارشادات عالیہ میں جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ان سے دونوں کے باہمی اخلاص و محبت پر پوری روشنی پڑتی ہے مولانا ظفر علی خان ایک رباعی میں عزیز مگسی کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

تم کو خفی عزیز ہے ہم کو جلی عزیز
عارض کا گل تمہیں ہمیں دل کی کلی عزیز

لفظ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے
معنی ہیں اس کلام کے یوسف علی عزیز

نسیم تلوی مرحوم مدیر بلوچستان جدید سے روایت ہے کہ جب عزیز مگسی ولایت سے وطن واپس لوٹے تو وہ مولانا ظفر علی خان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عزیز مگسی کی آمد کی تقریب پر بلوچستان جدید کے لیے ایک نظم کہنے کی فرمائش کی۔ مولانا ظفر علی خان یہ خبر سن کر فرط مسرت سے جھوم اٹھے، حقہ سامنے دہرا تھا، فرمایا تو پھر کاغذ قلم سنبھالو۔ نسیم نے تعمیل ارشاد کیا آپ نے حقے کا ایک طویل کش لگانے کے بعد فرمایا:

مبارک ہو یوسف علی خان کی آمد
گلستان میں ابر بہاراں کی آمد

دوسرا کش لگایا تو دوسرا شعر لکھوایا :

جہاں کفر کی ظلمتیں چھا رہی ہیں
وہاں ایک مرد مسلماں کی آمد

چنانچہ بیٹھے بیٹھے انہوں نے ایک طویل اور مرصع نظم مکمل کر ڈالی ۔

اس واقعہ سے جہاں مولانا ظفر علی خان کی بدیہہ گوئی پر روشنی پڑتی ہے وہاں عزیز مگسی سے ان کی گہری محبت اور پرخلوص وابستگی کا اظہار بھی ہوتا ہے ۔

مولانا ظفر علی خان کے علاوہ عزیز مگسی علامہ اقبال کے بھی بے حد عقیدت مند تھے ۔ شاعر مشرق کے ہم عصر کی حیثیت سے عزیزمگسی کے افکار اور خیالات پر اقبال کی شاعری کے نمایاں اثرات موجود ہیں ۔

شاعر مشرق نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا پیغام دیا جیسا کہ فرماتے ہیں :

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

اسی طرح یوسف عزیز مگسی اہل وطن کو اتفاق و اتحاد کی تلقین کرتے ہوئے شمع وطن پر نثار ہونے کا درس دیتے ہیں :

ضرورت ہے کہ پھر شمع وطن پر نذر ہونے کو
وطن زادوں سے اک آتش بجاں پروانہ ہو جائے

جس طرح علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے اوائل میں طویل قومی نظمیں لکھی ہیں ۔ عزیز مگسی نے بھی اسی انداز میں طبع آزمائی کی ہے ۔ علامہ اقبال اپنی شہرہ آفاق نظم تصویر درد کے ایک بند میں فرماتے ہیں :

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا
مجھے اے ہم نشین رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

عزیز مکسی بھی شاعر مشرق کے متبع ہیں ، اسی بحر میں اسی قسم کے خیالات و جذبات اور عزائم کا ارادہ کرتے ہیں جس قسم کے جذبات کا اظہار شاعر مشرق نے کیا ہے دونوں کے انداز بیان اور خیالات میں اس قدر ہم آہنگی اور یکسانیت ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عزیز مکسی نے یہ نظم شاعر مشرق کے خصوصی رنگ میں گویا ڈوب کر کہی ہے ۔ عزیز مکسی کے اشعار میں وہی سوز و ساز وہی جوش و خروش اور وہی رنگ و نم جھلکتا ہے جو شاعر مشرق کا محبوب ترین انداز ہے ۔ عزیز مکسی فرماتے ہیں کہ :

قسم ہے ان نیازوں کی جو ناز عشق بن جائیں
قسم ہے ان نمازوں کی جو راز عشق بن جائیں
قسم رسوائیوں کی جو کہ آغاز محبت ہیں
قسم بربادیوں کی جو کہ انجام محبت ہیں
قسم ہے غزوہ بدر و احد میں مرنے والوں کی
قسم ہے کربلا میں پیاس سے جاں دینے والوں کی
وطن کی تاریک راتوں کو چراغستان بنانے میں
میں اپنے عرق خون سے شمع دل جلوا کے چھوڑوں گا
میں پھر انداز نو سے نغمہ حب وطن گا کر
سکوت اندوز تار اسلام کا بجوا کے چھوڑوں گا
میں پھر افسانہ دار و رسن کے گیت گا گا کر
کئی منصور اپنے ملک کو دلوا کے چھوڑوں گا

شاعر مشرق نے ایشیائی ممالک میں برطانوی استعمار کو ریشہ دوانیوں

اور نو آبادیات میں ان کی چیرہ دستیوں کو پوری طرح بے نقاب کیا۔ برصغیر میں انگریزوں کی کامیاب حکمت عملی کا یہ عالم تھا کہ برطانوی سامراج کے پنجۂ استبداد میں مقید ہونے کے باوجود سادہ دل عوام اس کے دام فریب میں مبتلا تھے۔ انگریزوں اور اس کے ایجنٹوں نے عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ وہ صرف پسماندہ اقوام کو تہذیب و تمدن اور علم و دانش کی راہ پر گامزن کرانے کے لیے آئے ہیں لیکن شاعرِ مشرق عوام کو انگریز کی چالوں سے آگاہ کرتے ہوئے فرنگی اقدار کو ایک ایسا فتنہ قرار دیتے ہیں جس کے آغوش میں سینکڑوں فتنے پوشیدہ ہیں :

فتنہ را کہ دو صد فتنہ در آغوشش بود
دخترے ہست کہ در مہد فرنگ است ہنوز

علامہ اقبال نے انگریز کی سیاسی حیلہ جوئیوں کا واشگاف الفاظ میں پردہ چاک کرتے ہوئے عوام کو خبردار کیا کہ آزادی کے سلسلے میں انگریز سے خوشگوار توقعات وابستہ کرنا سراسر نادانی ہے کیونکہ شاہین کے دل میں اس شکار کے لیے جو ان کے چنگل میں آیا ہو، کسی قسم کے جذبۂ ترحم کا پیدا ہونا ناممکن ہے :

ترا نادان امید غمگساری باز افرنگ است
دل شاہین نسوز بہرآن مرغے کہ در چنگ است

شاعر مشرق اپنی ایک نظم میں مغرب کے استعمار پسندانہ عزائم اور ہوس ملک گیری کو اس نوع کا زہر ہلاہل قرار دیتے ہیں جس کے سامنے سانپ کا زہر بھی ہیچ ہے :

من درون شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

عزیز مگسی بھی علامہ اقبال کی طرح نہ صرف عوام کو انگریزوں کے مکر و فریب سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ ماضی کی غلطیوں پر بھی متنبہ

کرتے ہیں کہ بلوچوں نے انگریزوں کو روایتی مہمان کی طرح اپنے ہاں بلا کر آستین میں سانپ پالنے کی شدید غلطی کی ہے ۔ فرماتے ہیں :

بلا کے بلوچوں نے جسے مہمان کیا
وہ ناسپاس بنا آستین کا مار اپنا

علامہ اقبال اور عزیز مگسی کے اشعار میں نہ صرف انگریزی اقتدار کے خلاف نفرت اور بیزاری کے مشترک جذبات کا اظہار کیا گیا ہے بلکہ شعری اعتبار سے بھی دونوں شاعروں کے تمثیل اور تشبیہہ میں بھی قریبی مماثلت ہے ۔

کہا جا سکتا ہے کہ شاعر مشرق کا شعر ایک آفاقی تخیل رکھتا ہے اور اس کے برعکس عزیز مگسی کا شعر علاقائی تصورات کا حامل ہے لیکن یہ خیال غلط ہے ۔

عزیز مگسی کا مذکورہ بالا شعر اس عہد کی یادگار ہے جب کہ انگریزی عہد اقتدار میں بلوچستان برصغیر کا وہ واحد صوبہ تھا جو سیاسی اصلاحات سے محروم تھا اس لیے عزیز مگسی اپنے صوبے کے عوام سے مخاطب ہوئے ورنہ عزیز مگسی کا انداز فکر عالمگیر اور آفاقی ہے ۔ عزیز مگسی کو برصغیر کے علاوہ تمام ایشیائی ممالک انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار نظر آتے ہیں ۔ ان کے خیال میں مصر ، ایران اور عراق کی آزادی محض برائے نام ہے اور یہ تمام ممالک براہ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر انگریزی اقتدار کے زیر اثر ہیں فرماتے ہیں کہ :

ہر کہ می نگرم جلوہ نما افرنگ است
مصر و ایران و عراق ایں ہمہ نام است اینجا

آرام پسندی ، عافیت کیشی اور عیش کوشی حصول آزادی کی جدوجہد میں سنگ گراں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان مقاصد کے لیے ہمت ، جرأت ، عزم و ثبات اور ایثار و قربانی کی شدید ضرورت ہوا کرتی ہے اس لیے علامہ اقبال نے اپنے کلام میں تن آسانی اور عافیت پسندی کے خلاف

مسلسل جہاد کیا ہے اور نوجوانوں کی سخت کوشی ، عزم محکم اور جہاد مسلسل کی تعلیم دی ہے :

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

علامہ اقبال اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے عافیت پسندوں کو سخت گوش مجاہدین کی صف سے الگ ہونے کی کوشش کی ہدایت کرتے ہیں تاکہ ان کی پست ہمتی اور کم حوصلگی مسلک شبیری پر چلنے والے مجاہدین کے عزائم پست کر کے ان کی صفوں میں انتشار کا باعث نہ بن سکے ۔ شاعر مشرق فرماتے ہیں :

تیر و سنان و خنجر و شمشیر آرزوست
با من میا کہ مسلک شبیر آرزوست

حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ عزیز مگسی بعینہ اسی خیال کو یوں پیش کرتے ہیں کہ :

اب آگے مرحلہ آتا ہے سخت کوشی کا
ہمارے ساتھ نہ اب کوئی عیش کوش آئے

جس طرح علامہ اقبال صرف سرفروش مجاہدین کو ساتھ لے کر منزل مقصود کی طرف آگے بڑھنا چاہتے ہیں اسی طرح عزیز مگسی سخت کوشی کے مرحلے میں داخل ہوتے ہی اپنے کم کوش رفیقان سفر کو رخصت ہو جانے کا مشورہ دیتے ہیں اور سرفروش محبان وطن کو کفن بدوش میدان عمل میں آنے کی یوں دعوت دیتے ہیں :

کرم ہے تیغ جفا کا بقدر وسعت شوق
جسے ہو ذوق تماشا کفن بدوش آئے
ضرورت ہے اک ایسے کاسہ سر، شعلہ دید کی
شراب آتشیں الفت کا جو پیمانہ بن جائے

جس طرح علامہ اقبال آزادی کے لیے سرفروشانہ زندگی کی تعلیم دیتے ہیں اور اس مہم میں قصہ دار و رسن کو بازی طفلانہ سے تعبیر کرتے ہیں کہ :

قصہ دار و رسن بازی طفلانہ دل
التجائے آرنی سرخی افسانہ دل

اسی طرح عزیز مگسی بھی دار و رسن کے گیت گا کر ایسے منصور پیدا کرنا چاہتے ہیں جو دار و رسن کی تاریخ ازسرنو دھرائیں :

میں پھر افسانہ دار و رسن کے گیت گا گا کر
کئی منصور اپنے ملک کو دلوا کے چھوڑوں گا

دشت و صحرا کی بدویانہ زندگی بادی النظر میں بے مصرف نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں کہستانی اور صحرائی زندگی فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے صحرا نوردی اور بادیہ نشینی کی زندگی ، محنت ، کوشش ، تلاش اور جدوجہد کی زندگی ہے ۔ کہستانی ماحول میں زندگی فطری تقاضوں کے عین مطابق پروان چڑھتی ہے ۔ یہی وہ طرز حیات ہے جو پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرنے والے شہباز اور شاہینوں کی تربیت کے لیے سازگار فضا فراہم کر سکتا ہے ۔ اسی لیے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ :

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مرد کہستانی

علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان ہے ''بڈھے بلوچ کی نصیحت اپنے بیٹے کو'' صحرا نشین بلوچوں کے کردار و عمل ، محنت و مشقت سے بھرپور عملی زندگی کی یوں عکاسی کی ہے :

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفت سیل رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اللہ کے پاس دی مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا
اخلاص عمل مانگ نیاگان کہن سے
"شاہان چہ عجب گر بنوازند گدارا"

شاعر مشرق کے خیال کے مطابق کوہستانی اور صحرائی فضا ہی وہ سازگار ماحول ہے جو اس قسم کے جفا طلب اور سخت کوش انسان پیدا کر سکتا ہے جو اپنے زور بازو سے کائنات کو تسخیر کر سکتے ہیں اس لیے عزیز مگسی بادیہ نشیں بلوچوں کو تسخیر کائنات پر آمادہ کرتے ہیں اور نظام فطرت کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی تلقین کرتے ہیں :

اٹھ اے بلوچ بدل دے نظامِ فطرت کو
جگر پہ تیر چلیں اور دل میں جوش آئے

علامہ اقبال سیاسی آزادی اور حصول اقتدار کے لیے طاقت اور قوت کو اساسی اہمیت دیتے ہیں ان کے نزدیک عدم تشدد کا فلسفہ حصول آزادی کا کوئی مؤثر حربہ نہیں کیونکہ انقلاب قوت اور تشدد کے بغیر نہیں آ سکتا ۔ اسی لیے علامہ اقبال مہاتما گاندھی کے برت کا یوں مضحکہ اڑاتے ہیں کہ :

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اسی خیال کو عزیز مگسی یوں بیان کرتے ہیں کہ :

نوائے گاندھی و جیکر سے کام نہ بن سکا
کہاں سا کوئی اب ساز پر خروش آئے

علامہ اقبال حصول آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے طاقت ، قوت اور تشدد کو لازمی عنصر قرار دیتے ہیں :

تازہ پھر دانش مغرب نے کیا سحر قدیم
گزرا اس عہد میں ممکن نہیں ہے ضرب کلیم
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زور حیدر، فقر بو ذر، صدق سلمانی

اسی نظریہ کی روشنی میں عزیز مگسی بھی آزادی کے لیے طاقت اور قوت کا استعمال ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ :

بنے گا کام نہ اب یاں قراردادوں سے
وہ سربلند ہے جو ان کے سرخیوش آئے

عشق اور عقل کا تقابل علامہ اقبال کی شاعری کا مستقل اور ہنگامہ آفرین عنوان ہے۔ شاعر مشرق نے ان الفاظ کو نہایت وسیع اور ہمہ گیر معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک مقصد کے ساتھ والہانہ اور مجنونانہ وابستگی کا نام عشق ہے۔ علامہ اقبال عقل کے مقابلے میں عشق کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ عقل مآل اندیش ہے اور نتائج و عواقب کے تجزیہ کے بعد منزل کی جانب بڑھتا ہے اور پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے اس لیے عقل کے ذریعے منزل تک رسائی کے لیے مدت العمر درکار ہے لیکن عشق کی منزل میں راہ کی دشواریوں اور حالات سے بے نیاز اور عواقب و نتائج کے فکر سے بے پرواہ پورے ذوق و شوق اور سرگرمی سے منزل مقصود کی جانب بڑھتا ہے اس لیے علامہ اقبال نے عشق کو فقیہ حرم امیر جنود، دم جبرائیل اور دل مصطفیٰ کے نام سے موسوم فرمایا ہے کہ :

عشق فقیہ حرم عشق امیر جنود
عشق ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق دم جبرائیل عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا پیام

علامہ اقبال کے تتبع میں عزیز مگسی بھی راہ طلب میں عقل و دانش کی کارفرمائی سے اجتناب کرتے ہیں اور جنون عشق کا دامن مضبوطی سے

تھام لینے کی خواہش رکھتے ہیں اور دانشمندوں کو بھی فرزانگی کی بجائے دیوانگی کی تعلیم دیتے ہیں :

فقط دانائیوں ہی سے مرادیں بر نہیں آتیں
ضرورت ہے کہ داناؤں سے اک دیوانہ ہو جائے

علامہ اقبال نے مافوق البشر یا مردِ کامل کا خیال پیش کر کے علمی دنیا میں ایک تھلکہ بپا کیا ۔ شاعر مشرق مردِ کامل جسے وہ سوار اشہب دوراں اور نور دیدہ امکاں کے نام سے یاد کرتے ہیں کے ظہور کے سلسلے میں یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں کہ :

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدہ امکاں بیا

عزیز مکسی کے کلام میں بھی مردِ کامل کا تصور موجود ہے اور یہ تصور ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کے کلام سے مستعار لیا گیا ہے ۔ عزیز مکسی فرماتے ہیں کہ :

ضرورت ہے وطن کو ایک ایسے مردِ کامل کی
کہ دستِ جنسِ آزادی کا جو بیعانہ ہو جائے

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں مسلمانوں کو ایک زندہ فعال اور مثالی قوم بننے کے لیے تجدید و احیائے اسلام کی تلقین کی ہے اور اسلاف کا کردار اور اسلامی اقدار کو اپنانے کی تعلیم دی ہے جیسے کہ فرماتے ہیں :

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

عزیز مکسی بھی اسی طرح ہمیں اسلامی اقتدار کے احیاء کے علمبردار نظر آتے ہیں کہ :

سبق دے کر اخوت کا شجاعت کا محبت کا
میں پھر بگڑی بلوچستاں کی بنوا کے چھوڑوں گا

غرضیکہ عزیز مگسی اور علامہ اقبال کے کلام میں ہمیں مقاصد اور نصب العین کے اشتراک کے علاوہ ذہنی اور فکری ہم آہنگی کا پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے۔[1]

URDU RESEARCH CENTRE
A.C.C. No.
96
Old: 11890

- روزنامہ "مشرق، کوئٹہ، ۲۶ نومبر ۱۹۷۷ء

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

علامہ اقبال اور تحریک پاکستان

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو نقشہ عالم پر ایک نیا ملک نمودار ہوا۔ تاریخ کی آنکھوں نے یہ تو بار بار دیکھا تھا، کہ ایک قوم ایک جاندار اور صحت مند نظریے کے بل پر بنی اور جب اس نظریے کے علمبرداروں نے نبض وقت کو نہ پہچانا اور حالات کے ساتھ ساتھ چلنے سے انکار کردیا تو وہ قوم بگڑ گئی اوج ترقی سے اعماق ذات میں گرگئی پھر زمانے کی چکی میں پس کر یہی قوم ایک نئے نظریہ حیات اور بلند مقصد کے سہارے اٹھی۔ پانچ ہزار سال قبل از مسیح سے قوموں کا یہ سفر ہنوز جاری ہے اور شاید ابد تک جاری و ساری رہے گا۔ تاریخ کی نظروں نے یہ بھی دیکھا کہ چند من چلے انسان سمندروں کا سینہ چیرتے ہوئے انجان سرزمینوں میں پہنچ گئے، جہاں انہوں نے اپنی روایات ماضیہ، قوت ارادی اور کرشمہ علم سے تہذیب و تمدن کے لاتعداد فانوس روشن کر دیے، امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور سمندروں میں ابھرتے ہوئے بے شمار ننھے منے جزیرے ہیں جنھیں انسانی تہذیب کے احاطہ میں لایا گیا ہے اور تمدن آدم کی شعاعوں سے انہیں منور کیا ہے۔ لیکن اس نئے ملک کا وجود خود تاریخ کے لیے ایک انوکھا تجربہ اور ایک اچھوتا مشاہدہ تھا۔ ایک ایسا ملک جو جغرافیائی دریافت بھی تھا اور تاریخی بھی، ایک ایسا ملک جس میں ایک قوم بستی تھی لیکن وہ دو حصوں میں منقسم تھا، جن کا درمیانی فاصلہ کم و بیش دو ہزار میل کے قریب تھا۔ ایک ایسا ملک تھا جس کے دونوں حصے ایک سی تڑپ اور ایک ہی مقصد سے بے تاب اور سرشار تھے، لیکن ہر حصے کی آب و ہوا اور بود و باش بہت مختلف تھی۔ اس ملک کے قیام پر یقیناً ایک دنیا محو حیرت تھی۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو یہ نیا ملک پاکستان صفحہ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ یہ ایک کھلا ہو

راز تھا کہ اس ملک اور اس میں بسنے والی قوم کے سیاسی خالق قائد اعظم محمد علی جناح تھے ، وہی اس ملک کے پہلے گورنر جنرل ہوئے۔

اس ملک کی پیدائش سے ذرا قبل اور پیدائش سے فوراً بعد انسانیت سے جو دردناک ہولی کھیلی گئی اور انسانوں کو جس دردناک طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ، وہ بھی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے ، لیکن اس کے باوجود نہ تو ملک کا ناظم گھبرایا اور نہ ہی یہاں کی قوم نے دل چھوڑا ، لوگ گرتے پڑتے اور مرتے رہے لیکن اُن کے تھرتھراتے ہوئے لبوں سے ایک ہی لفظ برآمد ہوتا رہا۔ پاکستان۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں آباد مسلمانوں کی روح ، ان کا ضمیر ، ان کی تاریخ ، ان کے قلب و نظر ، ان کی قوتِ کار ، اور اُن کا ذوقِ تخلیق پگھل پگھل کر اس جہان خیز لفظ میں سما گیا تھا۔

ایسا کیونکر ہوا ؟ — یہ ایک طویل کہانی ہے اور اگر پردہ اُٹھا دیا جائے تو ہمیں اس لفظ کا پس منظر وسیع تر نظر آئے گا۔ جب یہ پردہ اُٹھتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ قائدِ اعظم ایک مرد نہیں تھے ، حیاتیات کی روح سے ہر انسان صدیوں کی جدوجہد کا ثمرہ ہے ، بالکل ایسے ہی تاریخی لحاظ سے ہر تحریک صدیوں کی پیداوار ہے ، اور قائدِ اعظم اصل میں بہت سے افراد کا مجموعہ تھے ، وہ ہزاروں الحاد ماضیہ اور روایات گزشتہ کے کندھوں پر کھڑے تھے بلکہ ان کا سیاسی ظہور تھے ، یہ تو تاریخی حقیقت ہے کہ جیسے کڑک سے پہلے بجلی کا لشکارا ضروری ہے بالکل ایسے ہی تخلیق سے پہلے تخیل اور تصور ضروری ہے۔

انقلاب فرانس کی خون آشامی کے لیے والٹیئر کا ہمہ سوز فلسفہ درکار ہے اور اسی انقلاب کی جمہوریت پسندی کے لیے روسو کا وسیع تر نظریہ انسانیت چاہیے۔ تحریک اصلاح مذہب کے لیے تحریک احیائے علوم کی ضرورت ہے ، انقلاب روس کے لیے میکسم گورکی ، ٹالسٹائی اور پشکن پہلے آتے ہیں اور پھر لینن اور سٹالن پیدا ہوتے ہیں اور قائدِ اعظم اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ وہ علامہ اقبال کے ذہنی پیرو تھے۔ تاریخ میں

پاکستان کا پہلا ذکر اُنہوں نے کیا ، علامہ اقبال تین صلاحیتوں کے مالک تھے ، وہ والٹیئر کی طرح ہم سوز اور روسو کی طرح جذباتی نہیں تھے - یہ تین صلاحیتیں اُن کے خیالات کی دنیا میں ہر وقت موجود تھیں -

(۱) قوتِ تنقید (۲) قوتِ تجدید (۳) قوتِ تخلیق - ان تینوں کے جماتی مجموعہ کا نام تھا اقبال ! !

قوتِ تنقید اُن کے وسیع مطالعہ مشاہدہ حقائق اور ژرف نگاہی کا نتیجہ تھی - چنانچہ وہ موجودہ تہذیب ہندوستانی سماج اور مسلمانوں کے مصائب کے نقاد بنے ، خواہ وہ یورپ کے استعمار پسند ہوں ، خواہ وہ قدامت پسند طبقہ ہو اور خواہ روشنی یافتہ طبقہ ، وہ کسی کو نہیں بخشتے تھے اور چھان بین کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے :

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہٴ مسجد ہوں ، نہ تہذیب کا فرزند

اُن کی قوتِ تجربہ کا انحصار اصل میں اُن کی قوتِ تنقید پر ہی تھا کیونکہ جہاں وہ معاشرہ اور معاشرتی نظام کے مصائب کو دیکھتے تھے وہیں اس کے محاسن کو نظرانداز بھی نہیں کرتے تھے - مثلاً وہ اگر یورپ کی تاجرانہ و ظالمانہ ذہنیت اور اس کی لوٹ کھسوٹ کے سخت خلاف تھے تو دوسری طرف وہ اس کی قدرتِ فکر و عمل ، اس کی تسخیر فطرت ، اُس کے ذوق حیات اور اس کی مصروفیت کے قائل بھی تھے - ان کے خیال میں موجودہ دور کے بعض طبقوں نے مسلمان ذہن کے دروازے بند کر دیے تھے ، لیکن وہ تاریخ اسلامیہ کے مثبت اور تعمیری پہلوؤں پر مسلسل نظر رکھتے تھے - حضور پاک سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بےانتہا عقیدت تو تھی ہی ، خلافت راشدہ ، عمر بن عبدالعزیز ، ہارون رشید ، محمد بن قاسم ، طارق بن زیاد ، محمود غزنوی ، اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان وغیرہ سے وہ بہت متاثر تھے - چنانچہ وہ مسلسل اپنے قارئین کو ان ادوار گزشتہ اور اُن کی روح رواں اقدار زندہ و پائندہ کی طرف کھینچتے تھے :

ع پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

لیکن ان کی یہ تجدید اصل میں ایک نئی تخلیق کے لیے رہنما تھی وہ اندھی تجدید کے قائل نہیں تھے ، بلکہ تہذیب کو رواں دواں اور ترقی پذیر سمجھتے تھے ، اس لیے وہ یورپ سے بہت سی باتیں سیکھ لینا چاہتے تھے :

جوہر میں لا الہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گر فرنگیانہ

وہ مستقل ایک جہان نو کا تصور اپنے ذہن میں رکھتے تھے :

پرانے ہیں یہ ستارے زمین بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو جو ہو ابھی نوخیز

اس نوخیز جہاں کو وہ روایت ماضیہ ، تقاضاے وقت اور تخلیق کے سہارے ایک مثالی جہان بنانا چاہتے تھے ، ان کے اسی جذبہ تخلیق کا اظہار ان کی دسمبر ۱۹۳۰ء کی الہ آباد کی تقریر میں یوں ہوا :

''اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کریں ، میں ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ ہندوستان اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کر رہا ہوں ، اس سے ہندوستان میں توازن قوت کے باعث امن و امان پیدا ہو سکے گا۔''

پھر علامہ نے فرمایا :

''ایک سبق جو میں نے اسلام کی تاریخ سے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ آڑے وقت میں ہمیشہ اسلام ہی نے مسلمانوں کے وجود کو قائم رکھا ، اگر آج مسلمان اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کی زندگی بخشنے والے تخیل کا اثر قبول کر لیں تو ان کی منتشر اور پراگندہ قوتیں ازسرنو جمع ہو جائیں گی ، اور ان کا وجود تباہی و بربادی سے یقیناً محفوظ ہوجائے گا''۔

نتیجتاً ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور سامنے آئی مگرخود علامہ اقبال بھی ایک ثمرہ تھے ، بہت سے افراد ، بہت سے نظریات اور صد ہا سال کی تاریخ

کے ۔ ان کے دماغ میں جو کش مکش تھی اور ان کے قلم سے جو کچھ نکلتا تھا وہ صدیوں کی تگ و تاز اور سوز و ساز کا نتیجہ تھا ۔

پاکستان ، جس کا سیاسی ظہور قائدِ اعظم تھے اور نظریاتی ظہور علامہ مرحوم و مغفور درحقیقت قراردادوں اور تقریروں کا نتیجہ نہیں تھا ، یہ اصل میں یہاں کے مسلمانوں کا سوزِ دروں تھا ، اس کے سوتے بہت گہرے تھے اور اس کا منبع بہت دور دراز واقع تھا ۔ تحریکِ پاکستان صد ہا سال کے کروڑوں انسانوں کی آمنگ تھی اور اسی لیے یہ عوام میں بجلی کی طرح دوڑ گئی ۔

ماضی کی طرف چلیں تو معلوم ہو گا کہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کم و بیش ایک ہزار سال تک رہی ، اس دوران میں انہوں نے غیر مسلموں بالخصوص ہندوؤں کے ساتھ اپنے بہترین حسنِ سلوک ، مروت اور روا داری کا مظاہرہ کیا لیکن ہندوؤں کے دلوں سے کبھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات میں کمی واقع نہ ہوئی ۔ وہ مسلمانوں کو ملیچھ اور ناپاک ہی سمجھتے رہے ، اور یوں ایک ہزار سالہ دورِ حکومت کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان معاشرتی بعد قائم رہا ۔

مسلمانوں کی آمد سے اس برعظیم نے اپنی زندگی کا نیا ، تازہ اور پائیدار دور دیکھا تو ہندو مت سطحی نظر آنے لگا اور اس کی باطنی خامیاں روزِ روشن کی طرح جھانکنے لگیں ۔ ہندو مت کے مقابلے پر اسلام ایک واضح اور داخلی طور پر ایک مضبوط مذہب تھا ۔ (اور ہے) وہ ایک ضابطہ حیات تھا جس نے ہر فرد کی زندگی اور سماج کے ارتقا اور حکومتوں کے قول و فعل کو متعین کر دیا ۔ مساوات اور اخوت کے اصولوں نے اس میں اندرونی طور پر ایسی وسعت پیدا کردی جو ہندو مت کو ذات پات کی غیر انسانی تمیز نے حاصل نہ ہونے دی تھی ۔

اسلام توحید پرستی کا بہت سختی سے قائل ہے وہ مصر ہے کہ انسان صرف ایک خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو ۔ وہ فطرت پرستی ، بت پرستی اور مظاہر پرستی کا ان تھک مخالف ہے ، کیونکہ اس کے نزدیک یہ سب کچھ انسانی خودی کی نفی ہے اس کے برعکس ہندو مت حیوانات ، مظاہر فطرت

اور دیوتاؤں کا پرستار ہونے کے علاوہ ایک خدا کا پجاری ہو سکتا ہے اور خدا کی ہستی سے یکسر منکر بھی - ہندو تثلیث تین دیوتاؤں برہما ، وشنو اور شوا پر مشتمل ہے - ان دیوتاؤں کے اوتار اور ان کی مورتیاں ہندوؤں کو عزیز ترین ہیں - اسلام توحید کے معاملے میں کسی سمجھوتے کا قائل نہیں اور ہندو مت لازماً بت گر و بت پرست ہے - اسی توحید پرستی کی بنا پر مسلمانوں کی انفرادیت اور علیحدہ قومیت کو برقرار رکھنے کے لیے امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی نے مجاہدانہ تگ و تاز سے کام کیا - بقول علامہ اقبال :

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

امام ربانی کے کام کو سر سید احمد خان نے آگے بڑھایا اور کہا ، "مجھے یقین ہو گیا ہے کہ مسلمان اور ہندو یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی -"

ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ مخالفت اور عداوت (جو ہندوؤں و مسلمانوں کے درمیان ہے) ان ہندوؤں کے سبب ابھرتی جائے گی جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں -

علامہ اقبال نے بھی اسی سلسلہ میں معنی بلیغ فرمائی جس کے نتیجہ میں جداگانہ قومیت کی بنیاد پر ایک علیحدہ مملکت کا تصور مسلمانوں کے لیے پیش کیا ، اسی کے باعث آپ مفکرِ پاکستان کہلائے - بعد ازاں آپ نے محمد علی جناح کے بارے میں فرمایا کہ وہی مسلمانوں کی مناسب انداز پر رہنمائی کر سکتے ہیں - ۱۹۳۶ء میں ایک روز علامہ اقبال کے ہاں قائدِ اعظم محمد علی جناح کی دیانت ، امانت اور قابلیت کا ذکر ہو رہا تھا آپ نے فرمایا کہ "مسٹر جناح کو خدا تعالیٰ نے ایک ایسی خوبی عطا کی ہے جو آج ہندوستان کے کسی مسلمان میں مجھے نظر نہیں آتی - حاضرین میں سے کسی نے پوچھا وہ کیا خوبی ہے ؟ آپ نے انگریزی میں کہا :

He is uncorruptable and Unpurchaseable

(نہ تو وہ بدعنوان ہیں اور نہ انہیں خریدا جا سکتا ہے) -

علامہ اقبال نے قائد اعظم محمد علی جناح کو مسلمانوں کے لیے جداگانہ ریاست کے حصول کی خاطر تیار بھی کیا جس کا ثبوت قائد اعظم کے نام آپ کے خطوط مہیا کرتے ہیں۔ ۲۱ جون ۱۹۲۸ء کو آپ نے قائد اعظم کو تحریر کیا کہ ''آپ بہت مصروف ہیں مگر مجھے توقع ہے کہ میرے بار بار خط لکھنے کو آپ بار خاطر خیال نہ کریں گے۔ اس وقت جو طوفان شمالی مغربی ہندوستان اور شاید پورے ہندوستان میں برپا ہونے والا ہے اس میں صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے قوم محفوظ رہنمائی کی توقع کا حق رکھتی ہے۔''

علامہ اقبال کے خطوط قائد اعظم کے نام برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ایک اہم اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوط میں جن مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں سے بعض یہ ہیں۔

مسلم لیگ کی تنظیم نو، اسے عوامی جماعت بنانے کے لیے اس کے منشور اور پروگرام میں تبدیلی کی ضرورت، اس کا دوسری مسلم جماعتوں سے اتحاد و توازن، آل انڈیا کنونشن کے انعقاد کی تجویز، قانون ہند ۱۹۳۵ء کمیونل ایوارڈ کے بارے میں مسلم پالیسی، ہندو مسلم فسادات، جناح سکندر معاہدہ، مسئلہ فلسطین اور برصغیر پاک و ہند میں امن و امان کے قیام اور اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے ایک مسلم ریاست کے قیام کی ضرورت اور اہمیت وغیرہ۔

قائد اعظم کے الفاظ میں ان (علامہ اقبال) کے خیالات پورے طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے۔۔۔ اور کچھ عرصہ بعد یہی خیالات ہندوستان کے مسلمانوں کی اس متحدہ خواہش کی صورت میں جلوہ گر ہوئے جس کا مظہر آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی منظور کردہ قرارداد لاہور ہے جو عام طور پر قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم ہے۔

قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد ۲۴ مارچ کو قائد اعظم نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سید مطلوب الحسن سے کہا: ''اگرچہ اقبال آج

ہم میں نہیں ہیں ، اگر وہ زندہ ہوتے تو وہ یہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے کہ ہم نے بعینہ وہی کیا جو ان کی خواہش تھی ۔

قائدِ اعظم نے ۲۔ مارچ ۱۹۴۱ء یومِ اقبال کی ایک تقریب میں کہا تھا ''مجھے اس امر کا فخر ہے کہ میں نے ان کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے ۔ میں نے ان سے زیادہ وفا دار رفیق اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا ، جس بات کو وہ صحیح خیال کرتے تھے یقیناً وہ صحیح ہوتی تھی اور وہ اس بات پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتے ۔''

اس سے پیشتر قائدِاعظم نے ۱۹۴۰ء میں یوں فرمایا تھا : ''کارلائل نے شکسپیئر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا کہ اسے جب شکسپیئر اور دولت مشترکہ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے کہا کہ میں شکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دوں گا ۔ گو میری سلطنت نہیں ہے لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبال اور سلطنت میں کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبال کو منتخب کروں گا'' ۔

۱۹۴۴ء میں یومِ اقبال کے موقع پر قائدِ اعظم نے علامہ اقبال کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا :

''اگرچہ آج اقبال ہم میں موجود نہیں لیکن اس کا غیر فانی کلام ہمارے دلوں کو گرماتا رہے گا ۔ ان کی شاعری جو کہ حسن بیان کے ساتھ حسن معانی کا بھی آئینہ دار ہے ۔ اس عظیم شاعر کے دل و دماغ میں ان پنہاں جذبات حیات اور افکار کی عکسی بھی کرتی ہے جن کا سرچشمہ اسلام کی سرمدی تعلیم ہے ۔ اقبال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے پیروکار تھے ۔ وہ اول تا آخر مسلمان تھے اور اسلام کے صحیح مفسر تھے ۔

اقبال محض ایک فلاسفر اور معلم ہی نہ تھے بلکہ وہ حوصلہ ، عمل ، استقامت اور خود اعتمادی کے پیکر بھی تھے ۔ سب سے بڑھ کر انہیں اللہ تعالیٰ پر لازوال ایمان و ایقان تھا ۔ وہ اسلام کی خدمت

کے جذبے سے سرشار تھے - ان کی زندگی ایک شاعر کے بلند مقاصد کے ساتھ ایک عملی انسان کی حقیقت پسندی کا حسین امتزاج تھی - اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ سعی پیہم ان کے پیغام کا جزو لاینفک ہے ، اس لحاظ سے وہ صحیح معنوں میں اسلامیت کا نمونہ تھے -

میں پورے خلوص سے یوم ِ اقبال کی کامیابی کا خواہاں ہوں ، اور یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اُن اُصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے ، جن کی جھلک اُن کے کلام میں موجود ہے - تا کہ ہم بالآخر پاکستان حاصل کر کے انہی اصولوں کو اپنی مکمل طور پر خود مختار اور آزاد مملکت میں جا کر جاری و ساری کر سکیں -''

یہ تھا مختصر سا تاریخ ِ پاکستان کا تجزیہ جو قائد ِ اعظم کے مجاہدانہ عمل اور ناقابل ِ تسخیر جذبے سے پروان چڑھی اور جس میں علامہ اقبال کی گہری سوچ اور مومنانہ فراست کی چھاپ بالکل صاف دکھائی دیتی ہے - اب بھی فضاؤں میں علامہ اقبال کی آواز آ رہی ہے :

سبق پھر پڑھ صداقت کا ، عدالت کا ، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

---

(۱) اقبال اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ ، سردار ، محمد اقبال لاہور - ۱۹۷۵ ، ص ۲۸ ، ۲۹ پر مندرج ہے :

''بنگلہ دیش کے قیام سے جو لوگ آج یہ کہہ رہے ہیں کہ دو قومی نظریہ ختم ہو گیا ہے ، وہ میرے نزدیک سراسر غلطی پر ہیں - بنگلہ دیش کا ایک علیحدہ ریاست کے طور پر وجود میں آنا اور بھارت میں مدغم نہ ہونا ہی اس بات کی واضح دلیل ہے - اگرچہ پاکستان کے دشمنوں نے اس کے خلاف شازش کر کے اس کے مشرق

حصے کو جارحیت سے الگ کر دیا ۔ تاہم دو قومی نظریہ آج بھی زندہ ہے ۔"

کتابیات

۱ - اقبال اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ ، ص ۱۱
۲ - آغاز اقبال ، غلام دستگیر رشید ، ص ۴۱ ، ۴۲
۳ - علامہ اقبال کے خطوط قائد اعظم کے نام ترجمہ مع مقدمہ و حواشی محمد جہانگیر عالم - لاہور ۱۹۷۷ء
۴ - پیش لفظ از قائد اعظم - علامہ اقبال کے خطوط قائد اعظم کے نام
۵ - محمد علی جناح ، ایک سیاسی مطالعہ (بزبان انگریزی) مطلوب الحسن سید ص ۲۳۱
۶ - ہفتہ وار حمایت اسلام لاہور ، ۶ مارچ ۱۹۴۱ء ص ۳
۷ - انقلاب لاہور - ۲۹ مارچ ۱۹۴۵ء ، ص ۳
۸ - اقبال پیامبر انقلاب شورش کاشمیری (فیروز سنز ۱۹۶۸ء)
۹ - قائد اعظم اور اقبال ، احمد شہید تحریک صفحہ نمبر ۱ ، ۷

* * *

اقبال ساغر صدیقی

یوم اقبال

پاکستان میں اب تک جتنی بھی حکومتیں آئیں، سب نے بقدر ظرف و توفیق علامہ اقبال سے استفادہ کیا۔ اگر وفاقی حکومت نے یومِ اقبال کو اہمیت نہ دی تو صوبائی حکومت نے چھٹی منائی۔ دراصل اس قسم کی دو عملی اس وقت تک تھی۔ جب تک علامہ اقبال کے یومِ پیدائش کا تعین نہیں ہوا تھا۔ چونکہ ہمارے اقبال شناس قوم کو مردہ پرستی کی تہمت سے بچانا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے کئی برس کی سوچ بچار و تحقیق کے بعد یومِ پیدائش مقرر کر دیا اور اب ہم لوگ یومِ وفات کے بجائے یومِ پیدائش اس لیے مناتے ہیں کہ "جو مشکل تب تھی یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے۔"

صاحبو حقیقت یہ ہے کہ ملک میں کوئی بھی حکومت ہو۔ خواہ وہ سول ہو یا ملٹری، علامہ اقبال کو نظرانداز کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی۔ یہ اور بات ہے کہ ہر حکومت اپنی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال کے ان ہی اشعار سے استفادہ کرتی ہے جو اس کی پالیسی کے مطابق ہوں۔ دراصل علامہ اقبال کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں ہر شخص کی پسند اور پالیسی کے مطابق اشعار مل جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ریڈیو ٹی وی کے علاوہ اب صنعتی اور تجارتی حلقوں میں بھی علامہ اقبال کے کلام سے بے دریغ استفادہ کیا جا رہا ہے — ہمارے ایک دوست نے کراچی میں ایک بیوٹی پارلر کھولا اور اس کے بورڈ پر علامہ اقبال کا یہ مصرع لکھا کہ:

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

اس کے کچھ عرصہ بعد ان کی دکان کے عین مقابل ایک اور ہوٹل بار کھل گیا جس کے سائن بورڈ پر لکھا تھا :

یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

ہمارے دوست احمد خاں درانی جو ملت کلاتھ ہاؤس کے مالک ہیں۔ ہر سال یوم اقبال پر علامہ اقبال پر علامہ کا کوئی شعر کپڑے کے بینر پر لکھوا کر آویزاں کرتے ہیں - اس سال انہوں نے یہ شعر منتخب کیا ہے :

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ

ہم نے پوچھا پچھلے سال آپ نے "ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ" لکھا تھا اسے کیوں بدل دیا ، تو بولے پچھلے سال ستارہ لان کی ایجنسی بھی میرے پاس تھی۔

بہرحال تاجروں اور صنعت کاروں کی طرح ہر حکومت اور حکومت کے نقش قدم پر چلنے والوں نے بھی علامہ اقبال کے کلام کی خوب تشہیر کی اور یہ ثابت کیا کہ اقبال حکومت اور عوام دونوں میں یکساں مقبول ہیں — مثال کے طور پر قائد اعظم اور لیاقت علی خان کے بعد جب خواجہ ناظم الدین برسر اقتدار آئے تو انہوں نے اس شعر کو اقبال کا بہترین شعر قرار دے کر اس پر سینکڑوں مقالے لکھے کہ :

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبح گاہی

اس کے بعد محمد علی بوگرہ ، چندریگر اور فیروز خان نون وغیرہ کی حکومتیں رواروی میں آتی رہیں تو اس وقت اقبال کے اس شعر پر یار لوگوں نے گرہ لگائی کہ :

تختی لگا دو پی ایم کے آگے
ہر شے مسافر ہر چیز راہی

پھر فیلڈ مارشل ایوب خان برسرِ اقتدار آئے تو ہر کنونشن میں یہ ترانہ گایا جانے لگا کہ :

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ایوب خان کے بعد یحییٰ خان برسرِ اقتدار آئے تو ہر طرف نیلے نیلے پیلے پیلے اودے اودے پیرہن کا ذکر ہونے لگا۔ اس کے بعد عوامی و انقلابی حکومت والے آئے تو انہوں نے ہو جمالو کی دھن پر:

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کا نعرہ لگایا اور آج کل ہم جس کو بھی دیکھتے ہیں وہ یہی کہتا ہوا بھاگا جا رہا ہے کہ:

مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

خیر حکومتوں کی باتیں چھوڑیے ہم طالب علم لوگ ہیں ہم اپنی باتیں کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اگر علامہ اقبال آج کسی کالج کے طالب علم ہوتے تو کیا ہوتا — اس کے لیے ہم نے سروے کیا کیونکہ فی زمانہ سروے کر اور ادیب بن جا کا نسخہ بھی سکۂ رائج الوقت ہے۔ ہمارے سوال پر کسی نے کہا تو ہم ان سے پوچھتے۔ پس چہ باید کرد۔ کسی نے کہا ان کے ہاتھ میں ذوالفقار علی خان کی موٹر کا پرانا ٹائر ہوتا۔ کسی نے کہا وہ بھی کالج لیٹ آیا کرتے یا کنٹین میں بیٹھ کر اپنی غزلیں سنایا کرتے۔ کسی نے کہا کلاس روم میں اپنے اشعار کی تشریح سن کر دم بخود رہ جاتے۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور یہی اقبال کا کمال ہے۔ اقبال پر جتنا لکھا گیا اتنا اس صدی کے کسی شاعر پر نہیں لکھا گیا۔ مگر اس کے باوجود اب بھی ایک تشنگی باقی ہے اور شاید یہی تشنگی ہم سب کو یومِ اقبال کے جلسوں میں جمع کردیتی ہے۔ اقبال کا پیغام سب انسانوں کے لیے ہے۔ اقبال نے نور اسلام سے جو شمع روشن کی ہے وہ آج بھی مشعل راہ بن سکتی ہے بشرطیکہ میں، آپ اور ہم سب مل کر اس کی روشنی میں منزل کی طرف چل پڑیں۔[1]

۱۔ قلم قبیلہ (منتخب ادبی تحریروں کا مجموعہ) جلد دوم، کوئٹہ، ۱۹۸۳ء ص ۳۲۸ تا ۳۳۰ (ناشر: قلم قبیلہ (ادبی تنظیم) کوئٹہ)

مسز ثاقبہ رحیم الدین

علامہ اقبال کا ذہنی ارتقا

موجودہ دور میں اکثر دنیائے علم و ادب میں ناقدین کسی ہستی کے اعلیٰ اور ارفع ہونے کا معیار انتہا پسندی سے بناتے ہیں۔ بعض اہلِ فکر و دانش نے شاعرِ مشرق کی عظمت سے مرعوب ہو کر، مجدد اور ولی کے نام سے نوازا۔ بعض مکتب فکر کے اہلِ قلم نے علامہ اقبال کو رجعت پسند، فسطائی اور سرمایہ داری کے ایجنٹ کا خطاب دیا۔ حق بات تو یہ ہے کہ اقبال کی شخصیت کی فلسفیانہ، سیاسی اور قومی نوعیت کی بلندیوں کو نہ بھی چھوا جائے تو محض فن شاعری اسے برصغیر ہند و پاک، اسلامی ممالک اور دنیا کے عظیم شاعروں میں شمار کرتی ہے۔

ایک عام فن کار کی زندگی اور اس کے فن پارے، ایک فلسفی اور مفکر شاعر سے ہمیشہ مختلف ہوا کرتے ہیں۔ یہ فرق فن کار کی شخصیت، ماحول، صلاحیت اور زبان و بیان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک عظیم فن کار اپنی جدت طبع اور تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر نئے تصور حیات اور مکتب فکر کو جنم دیتا ہے، اہم بات یہ ہے کہ بڑے فن کار کی تخلیقات میں انسانی زندگی کی طرح، ذہنی ارتقا ملتا ہے۔ ازل سے زندگی کا کارواں رواں دواں ہے۔ ہر پل ہر آن کائنات میں تخلیق اور تغیر کا عمل جاری ہے۔ اسی طرح خلاق ذہن رکھنے والا انسان بھی تمام عمر ذہنی سفر کرتا ہے۔ یہ تدریجی ارتقا اس کی موت کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔ آنے والے تخلیق کار اور نسلیں اس کارواں کو آگے اور بہت آگے لیے جاتے ہیں۔ آئیے ہم اس سفر پر شاعر مشرق، اقبال کے ساتھ چلیں۔ زاد راہ اور آغاز سفر کے لیے دیدہ و دل وا رکھیے اور نور بصیرت بڑھاتے رہیے۔

کلامِ اقبال بحرِ بےکراں ہے۔ اس کی گہرائیوں میں ڈوبنے سے پہلے،

ساحل سے اس کی وسعتوں پر نظر ڈالی جائے ۔ دنیائے علم و ادب میں ، ابتدا ہی سے اقبال کو جو اہمیت و عزت ملی اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کا عہد بلند پایہ اہل قلم یا صاحب فکر و دانش سے خالی تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ تاروں بھری چاندنی رات میں چراغ جلانا بڑا کٹھن کام ہے ۔ اس دور میں کئی ایسی ہستیوں نے جنم لیا جو اپنے اپنے دائرہ کار میں عظیم اور مستند تھیں ۔ برصغیر میں قائد اعظم ، مولوی عبدالحق ، رابندر ناتھ ٹیگور ، مولانا محمد علی جوہر ، اور سید سلیمان ندوی سب اقبال کے ہم عصر ہیں ۔ شعرا میں اصغر ، فانی ، جگر ، چکبست اور جوش ملیح آبادی کو معاصروں میں شامل کیا جائے گا ۔ نامور ادیبوں میں حالی ، شبلی ، آزاد اور اکبر الہ آبادی کے نام گنوائے جا سکتے ہیں ۔ سر سید کے انتقال کے وقت اقبال کی عمر بیس اکیس سال تھی ۔ انگلستان میں نطشے کے انتقال کو تھوڑا عرصہ ہوا تھا ۔ فرانسیسی مفکر برگساں اقبال کا ہم عمر اور ہم عصر تھا ۔ اسی طرح سیاسی شخصیتوں میں چرچل ، مسولینی ، مصطفیٰ کمال پاشا اور مفکروں میں برٹرینڈ رسل ، تھامس آرنلڈ ، شوپنہار ، کارل مارکس ، اقبال کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یہی زمانہ برنارڈ شا ، سمرسٹ ماہم ، اور سائنسدان آئن سٹائن جیسی عظیم شخصیتوں سے منور تھا ۔ علم و فن کے اس درخشاں دور میں اقبال نے اپنی بے پناہ فکری اور فنی بصیرت کی بدولت خود کو منوا لیا اور مشرق و مغرب دونوں پر اپنے خیالات کے گہرے اثرات مرتب کیے ۔

کلام اقبال کا تدریجی ارتقا ، اس کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے سے بخوبی سمجھ میں آتا ہے ۔ شیخ عبدالقادر کے خیال کے مطابق اقبال نے دوران سکول شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور بقول عبدالقادر سروری شاعری کی ابتدا مشن کالج سیالکوٹ سے ہوئی ۔ مولوی عبدالسلام ندوی ، اقبال کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں ۔ مولوی عبدالحق نے حیات اقبال اور شاعری کے دو ادوار قائم کیے اور انہیں حب وطن اور حب ملت کے نام سے موسوم کیا ہے ۔ پروفیسر فاروقی نے اقبال کے تخلیقی ارتقا کو چار درجے دیے ہیں ۔ اقبال کے قریبی دوست اور رفقا کے مستند خیال کے مطابق تین ادوار ہی متعین کیے جاتے ہیں ۔ خود

اقبال نے بانگ درا میں تین ادوار مقرر کیے اس لیے عام طور سے ادبی دنیا میں یہی تقسیم معتبر اور قابل توجہ ہے۔

اقبال کی شاعری کا پہلا دور

میٹرک پاس کرنے سے قبل یعنی ۱۸۹۲ء کے قریب اقبال کی غزلیں اخبار و رسائل میں چھپنی شروع ہو گئیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے:

جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں

آپ کی غزلیں ۱۸۹۳ء میں اور ۱۸۹۴ء میں رسالہ ''زبان'' دہلی میں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ رسالہ ''شور محشر'' اور ''خدنگ نظر'' میں بھی اقبال کی ابتدائی غزلیں پائی گئی ہیں۔ اس شعر کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے:

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

ایک اور غزل کے اشعار ہیں:

رہی نہ دہر میں اقبال وہ پرانی بات
کسی کے ہجر میں جینے سے شرمسار ہوں

چار سو پھول کا انبار نظر آتا ہے
شاید اس بزم میں اقبال غزل خواں ہو گا

اس دور کی کئی غزلیں اور نظمیں اب دستیاب ہوچکی ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں مشہور نظم ''نالہ یتیم'' پڑھی۔ اسی طرح شیخ عبدالقادر کے رسالے ''مخزن'' میں آپ کی نظم ''ہمالہ'' نے ادبی حلقوں کو متوجہ کرلیا۔ اس زمانے میں اقبال نے پہلے ارشد گورگانی اور بعد ازاں داغ دہلوی سے باقاعدہ مشورہ سخن کیا ہے۔ کہیں کہیں آپ کی غزلوں میں داغ کا رنگ جھلکتا ہے۔ کچھ زمانے کے مزاج اور کچھ عمر کا تقاضا تھا کہ اقبال تقلیدی رو میں آ کر کہتے ہیں:

نہ آئے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

اس پہلے دور میں اقبال پر جذبہ وطن پرستی ، متحد قومیت کا تصور ، اور آزادیٔ ہند کا نظریہ طاری ہے - نظم نیا شوالہ میں فرماتے ہیں :

پتھر کی مورتیوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس ضمن میں نظم ہلال عید ، ابر گہر بار اور ہندوستانی بچوں کا گیت پیش کی جا سکتی ہیں - نعرۂ آزادی کی گونج ، صدائے درد ، ترانۂ ہندی اور تصویر درد میں سنائی دیتی ہے -

اقبال کی ابتدائی شاعری پر مغربی نظریات کے اثرات کی جھلک نظر آتی ہے - مثلاً پیام صبح نامی نظم لانگ فیلو کی نظم سے ماخوذ ہے - نظم عشق و موت ، ٹینیسن کے خیالات سے ماخوذ ہے - نظم رخصت اے بزم جہاں میں ایمرسن کی نظم جھلکتی ہے - بچوں کی نظمیں مکڑا اور مکھی ، ہمدردی ، ماں کا خواب ، ایک پہاڑ اور گلہری ، سب یوروپین شعرا سے ماخوذ ہیں - اقبال نے بچوں کے ادب کو نیا رنگ دیا -

اقبال مناظر فطرت اور قدرتی حسن کے دلدادہ ہیں - فطرت سے دلی لگاؤ انہیں ابر رنگین ، ابر کہسار ، آفتاب ، اختر صبح اور ہمالیہ جیسی نظمیں لکھواتا ہے :

وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

نظم ایک آرزو میں خالص منظر نگاری اور مصوری کی اعلیٰ تصویر ملتی ہے -

شروع میں اقبال پر ایران کی صوفیانہ شاعری اور شعرا کی نیچرپسندی کا تھوڑا بہت اثر موجود ہے - گھریلو مذہبی ماحول کے نقوش بھی آپ کے دل پر تھے - لہذا تصوف جیسے فلسفے کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے -

اس وقت تصوف کا عام بنیادی تصور نفیٔ خودی اور فنا فی اللہ کا تھا۔ نظم بچہ اور شمع کا ایک شعر ہے:

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے غفلت ہے سرمستی ہے بے ہوشی ہے یہ

اقبال جیسے عظیم و مفکر شاعر نے بہت جلد ایسے تصورات کو بدل دیا۔ انسان کی فضیلت اور اس کے بیش بہا جوہر نظر میں آبھرے جن کا اظہار ''انسان اور بزم قدرت'' اور ''ایک پرندہ اور جگنو'' جیسی نظموں میں نظر آتا ہے۔ شاعر مشرق اقبال کا یہ زمانہ مجموعی طور سے جستجو، بے چینی اور تحقیق کا دور ہے۔ وہ مظاہر فطرت اور اس کی تسخیر سے حق اور اس کے اسرار جاننے کے متلاشی ہیں۔ نظم ''ماہ نو'' کا شعر ہے:

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلک سیماب پا ہوں مکتب ہستی میں میں

نظم ''چاند'' میں سوالیہ انداز سے کہتے ہیں:

قصد کس محفل کا ہے آتا ہے کس محفل سے تو
زرد رو شاید ہوا رنج رہ منزل سے تو

عدم خود آگاہی کی تشنگی کلام پر طاری محسوس ہوتی ہے۔

اقبال چمک، روشنی اور نور کے شیدائی ہیں۔ اشعار میں جگہ جگہ شمع، ستارے، جگنو اور چراغ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ وہ جگنو کو روشنی سراپا اور پتنگے کو روشنی کا طالب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور شاعر کے دل کو آسمان کے چاند سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ آپ کے کلام میں ایک روشن اور صحت مند زندگی کا تصور ملتا ہے۔

کم عمری ہی سے اقبال کو عظمت اور بڑائی سے محبت ہے۔ کبھی یہ محبت انسانی عظمت سے بھی ہے اور مادی چیزوں کے روپ سے بھی ہے۔ آپ نے غالب، مسولینی، حالی اور سرسید وغیرہ کی عظمت کا خود اعتراف کیا ہے۔ سنائی، فارابی اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہی سے

دلی عقیدت رکھتے ہی ہیں - مولانا رومی سے عشق کی بدولت اقبال ان کو اپنا مرشد مانتے ہیں اور خود کو ان کا خوشہ چیں کہتے ہیں - یہی وہ زمانہ ہے جب اقبال نے مغربی تہذیب و تمدن کا تنقیدی مطالعہ کیا اور وہ اس کے ساتھ ساتھ مشرق فلسفہ و تصوف کی گہرائیوں میں بھی ڈوبے - تحریک تصوف کے زیر اثر کہہ اٹھتے ہیں :

عالم ظہور جلوۂ ذوق و شعور ہے

علامہ اقبال کو ابتدا ہی سے دائمی تحریک کا شاعر کہنا بجا معلوم ہوتا ہے - ان کو منجمد اور ساکت چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے - وہ صحرا کی بیابانی ، سمندر کی موجوں کی ہلچل اور آفتاب کی کرنوں کے ارتعاش کے دلدادہ ہیں - مثلاً نظم آفتاب صبح میں بلا زحمت وہ سورج کو فضیلت نہیں دیتے :

تو اگر زحمت کش ہنگامۂ عالم نہیں
یہ فضیلت کا نشان اے نیر اعظم نہیں

اسی دور میں کہیں کہیں اداسی و تنہائی کا احساس بھی ملتا ہے جس کا اظہار خود کلامی کی صورت میں فراق ، گل رنگین اور موج دریا جیسی نظموں میں ہے - بہر کیف ابھی تک :

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور

اقبال ۱۸۹۹ء میں ایم اے کا امتحان پاس کر کے تعلیمی زندگی کو خیر باد کہہ چکے تھے - انہوں نے عربک ریڈر کی حیثیت سے اوریئنٹل کالج لاہور میں اپنی خدمات پیش کیں - ان دنوں قائم مقام پرنسپل پروفیسر آرنلڈ تھے جنہوں نے اقبال کی ذہنی دنیا پر گہرے نقش چھوڑے - ستمبر ۱۹۰۵ء میں جبکہ آپ کی عمر تقریباً اکتیس بتیس سال تھی ، اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے - یہیں سے علامہ کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے -

یورپ جانے سے قبل علامہ اقبال حضرت نظام الدین کے آستانے پر حاضر ہوئے اور اپنے اعلیٰ مقاصد کی کامیابی کی دعا کی ۔ آپ کیمبرج آتے ہی ٹرینٹی کالج میں Advanced Student کے طور پر داخلہ لے لیا اور اپنی تحقیق کا آغاز کردیا ۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد ۷ مارچ ۱۹۰۷ء کو انہوں نے مقالہ بعنوان The Development of Metaphysics in Persia مکمل کر کے داخل کیا اور کیمبرج یونیورسٹی نے ڈگری عطا کی ۔ علامہ اقبال کی ذہانت اور صلاحیتوں کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس اثنا میں بیرسٹری کا کورس بھی جاری تھا اور لنکنزان میں داخلہ لے رکھا تھا ۔ ان دنوں کیمبرج یونیورسٹی میں بھی پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری نہیں ملتی تھی اور یہ سلسلہ ۱۹۲۱ء کے بعد جاری ہوا تھا ۔ علامہ اقبال نے پی ایچ ۔ ڈی کے لیے میونخ یونیورسٹی سے رجسٹریشن کروا لی اور جولائی ۱۹۰۷ء میں انگلستان سے روانہ ہو کر جرمنی چلے گئے ۔ آپ نے تین ماہ برلن کی لائبریریز میں مسلسل مطالعہ جاری رکھا ۔ جرمن زبان پر عبور حاصل کیا اور نومبر ۱۹۰۷ء میں پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ اسی دور کا ایک شہرۂ آفاق مقالہ قومی زندگی ہے جو رسالہ مخزن میں اکتوبر ۱۹۰۴ء اور مارچ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا ۔

اقبال کو شراب علم کی لذت کشاں کشاں یورپ لے گئی تھی اور وہ بلاشبہ کامیاب و کامران ہوئے ۔ ان کے سامنے نیک مقاصد کا وسیع میدان تھا اس لیے انہوں نے خود کو کبھی شاعر نہ سمجھا اور نہ شاعر کہلوایا ۔ قیام یورپ کے زمانے میں وہ دور بھی آیا کہ اقبال نے شعرگوئی ترک کر دی مگر سر عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ نے مجبور کیا کہ وہ اپنا ارادہ تبدیل کر دیں ۔

علامہ اقبال کا پہلا سفر یورپ تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور اگر اسے ان کی شاعری کا عبوری دور کہہ لیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ شاعری کے اس دور میں پہلی نظر میں جو نکتہ نمایاں ہو کر ابھرتا ہے وہ ان کا جمالیاتی احساس اور فطرت سے قربت اور لگاؤ ہے ۔ اقبال نے بہت کم مگر اچھی فطری نظمیں کہیں ۔ مثلاً ایک شام ، حقیقت حسن ، چاند تارے اور تنہائی وغیرہ ۔ یہ نظمیں فنی حسن کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔

چند اشعار پر نظر ڈالیے :

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش

اور پھر :

پھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال فطرت انسانی اور فطرت میں ایک رابطہ اور ایک عجیب سی ہم آہنگی کا لطیف احساس رکھتے ہیں ۔

یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ قیام یورپ کے دوران شاعر مشرق اقبال کے کلام پر حسن و عشق کی دھنک سی چمک رہی ہے ۔ اس ضمن میں نظمیں ۔ ۔ ۔ کی گود میں بلی دیکھ کر ، کلی ، وصال اور حسن و عشق کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس جذباتی دور اور عمر کے تقاضے نے ان کی شاعری پر خوشگوار اثر ڈالا ۔ یہ اشعار ایک نوجوان کی قدرتی تمنا معلوم ہوتے ہیں :

وہ مست ناز جو پھولوں میں جا نکلتی ہے
کلی کلی کی زبان سے دعا نکلتی ہے

انہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے
کلی سے رشک گل آفتاب مجھ کو کرے

اقبال کے اس سبک اور دلکش انداز بیان میں بہت جلد ہی ذاتی غم اور تلخیاں بھی جھلک اٹھیں ۔ احساس تنہائی کی شدت نظم عاشق ہرجائی اور نوائے دل میں نمایاں ہے :

اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کر سو جا

اس دور کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری، محمد عظیم فیروز آبادی اور پروفیسر محمد عثمان کے خیال سے قطعی متفق نہیں کہ یورپ کے قیام کے چند سالوں میں اقبال محض حسن و جمال کی دنیا میں کھوئے رہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی رائے قابل قبول معلوم ہوتی ہے کہ اقبال اس دور میں بھی علمی و فکری اکتسابات سے ذرا بھی غافل نہیں رہے۔

اقبال پر یورپ کی ترقی اور کامیابی کے اسباب واضح ہوئے۔ آپ وسیع معاہدے و تجربات اور مطالعے کے ذریعے اسلام کی اصل روح اور علمی پیکر سے بخوبی آگاہ ہوئے۔ اقبال نے کل مشرق اور خصوصاً برِصغیر ہند و پاک کی زندگی پر عجمی شاعری کے مجموعی اثرات کو اچھی طرح سے محسوس کیا۔ یورپین ممالک کی تیز رفتار اور روشن دنیا نے اقبال کو ذہنی انقلاب سے گزارا، انہیں دیدہ ور بنایا اور ایک پیامبر کے نقوش ابھارے۔ اسی دور میں اسرارِ خودی کے بنیادی خاکے نے ذہن اقبال میں وجود لے لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اقبال مغربی فلسفہ حیات کا گہرا مطالعہ نہ کرتے اور یورپ کی دنیا سے دور رہتے تو شاید شکوہ اور جواب شکوہ تو ضرور لکھتے مگر تصانیف اسرار خودی اور رموز بے خودی اس قدر ادبی بلندیوں کو نہ چھو پاتیں۔ جس طرح توانائیاں اپنا رستہ ڈھونڈتی ہیں اور قوتیں نمایاں ہونے کی خاطر بکھر بکھر جاتی ہیں، اسی طرح اقبال نے سفر کے لیے اپنا راستہ بنانا شروع کر دیا تھا۔

علامہ اقبال کی شاعری کی عظمت اور آفاقیت کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے بحر ادب و فلسفہ میں خوب تر ہوئے مگر ڈوبے نہیں اور نہ اپنا وجود تبدیل کیا۔ اقبال نے نطشے، برگساں، ہیگل، شوپنہار، کارل مارکس سب کا وسیع مطالعہ کیا۔ آپ نے مشرق اہلِ علم و فکر، ابنِ عربی، سنائی، فارابی اور غزالی کی تحریروں کا اثر بھی لیا مگر آخر میں مولانا رومی کو اپنا ذہنی راہبر اور مرشد بنا لیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب علامہ اقبال کا نظم فکر مرتب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ آپ نے طلبہ علی گڑھ کے نام جیسی معنی خیز اور تابناک نظم لکھی:

اوروں کا ہے پیام اور ، میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے
طائر زیر دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائر بام اور ہے

اگرچہ علامہ اقبال یورپ میں تھے مگر برصغیر ہند و پاک نے سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ عشق کے دردمند کا پیام یقیناً آزادی اور نئے راستوں کی نشاندہی کرتا ہے ۔ اقبال اصل مقصد حیات کی تلاش میں محنت اور عزم کے ساتھ کہہ اٹھتے ہیں :

ع زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

اسی دور کے کلام میں اقبال کا متحد قومیت کا تصور یا نیشنلزم تبدیل ہو کر تصور اتحاد ملت اسلامیہ میں ڈھلتا گیا ۔ تصویر درد لکھنے والا اقبال صقلیہ اور عبدالقادر کے نام جیسی بلند پایہ نظمیں تخلیق کرنے لگا۔ دونوں نظموں میں پین اسلامزم کی جھلکی دیکھیے ۔ صقلیہ میں لکھتے ہیں :

درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

اور پھر عبدالقادر کے نام میں پیام ہے :

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

کلام اقبال میں ایک اہم نظریاتی موڑ یہ نظر آتا ہے کہ نفی خودی کا میلان رکھنے والے اقبال اثبات خودی کا تصور پیش کرنے لگے ۔ یہی کلام اقبال کا مرکز و محور ہے ۔ اقبال نے بصیرت اور کشادہ نظری کی بدولت قدیم عجمی تصور سے کنارہ کشی کر لی ۔ اقبال کے اشعار میں جوش حیات اور عمل پیہم کے درس کا ساز صاف سنائی دینے لگا ۔ نظم چاند اور تارے میں کہتے ہیں :

اس راہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

جوں جوں اقبال نے یورپین ممالک کا بغور مطالعہ کیا وہ مزید حقیقت پسند بنتے چلے گئے ۔ دراصل اس زمانے میں شاعر اقبال ، فلسفی اور مفکر اقبال کی جانب سے ہاتھ بڑھا رہا تھا ۔ حقیقت نگاری میں یہ انداز بیان ہے :

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

عجیب چیز ہے احساس زندگانی کا
عقیدہ عسرت امروز ہے جوانی کا

کوئی نہیں ہے غمگسار انسان
کیا تلخ ہے روزگار انسان

دور اول سے کلام اقبال میں محبت ایک بنیادی قدر ہے ۔ یہی ان کے ذہنی سفر کا زاد راہ ہے ۔ برخلاف مشرق شعرا اور فلسفیوں کے اقبال محبت کو خوشی دینے والا جذبہ سمجھتے تھے ۔ اقبال محبت کو صرف دکھوں کا مداوا نہیں جانتے بلکہ اسے وسیع پیمانے پر کارساز اور عمل کے لیے تازیانہ بنا دیتے تھے ۔ اقبال کے نزدیک وطن ، دین ، انسان اور خدا سے محبت سب مل جل کر عشق کی صورت میں جلوہ گر ہوتی تھی ۔ دراصل اقبال کی شاعری کے دوسرے دور میں حیات انسانی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کا عشق اپنی جڑیں پکڑ رہا تھا ۔ اس دور میں اقبال کی غزل گوئی اپنی سمت مقرر کر لیتی ہے اور فلسفۂ حیات کی تمہید بھی ہو جاتی ہے ۔ تاہم ان کی غزلوں میں حسن تغزل کی تمام کیفیات پیدا نہیں ہوئی تھیں ۔ ۱۹۰۷ء کی یہ غزل دلنشین ہے :

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا
میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری ، نفس میرا شعلہ بار ہو گا

غرض کہ شاعری کا دوسرا دور جو تین سال پر مبنی ہے فکر اقبال کی خاص نہج کو واضح کرتا ہے۔ اس سے پیام اقبال کی حرارت اور اعتماد و پختگی کا احساس ملتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا تیسرا دور

۱۹۰۸ء میں علامہ اقبال اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس آئے۔ یہ حقیقت بھی ہے اور اس کا اقبال خود اقرار بھی کرتے ہیں کہ تعلیمی وسعت اور یورپ کے مشاہدات و تجربات نے ان کے ذہن و فکر کو پختگی اور جلا بخشی۔ بلاشبہ اقبال نے اپنی خداداد ذہانت اور صلاحیت کے برتنے پر مشرق و مغرب اور قدیم و جدید فلسفے کے مطالعے سے بےپناہ علم و ادب کے خزانے حاصل کیے۔ وہ کسی حد تک عالمگیر اور آفاقی نظریات سے متاثر بھی ہوئے لیکن مکمل طور پر وہ کسی دبستان فکر سے وابستہ نہ ہوئے۔

شاعری کے اس تیسرے دور میں اقبال کے کلام کا شاعرانہ حسن ، واضح فکری نظام اور ضابطہ حیات کے تحت ابھرتا ہے۔ اقبال کا فن شاعری سے مقصد محض اظہار نہیں بلکہ ان کے نزدیک ابلاغ بھی اسی قدر اہم ہے۔ ان کے کلام میں پیغام پہنچانے کے لیے خطابت کا انداز اور الہامی شان نظر آتی ہے۔ بال جبریل کی غزل دیکھیے :

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

یورپ سے واپسی پر اقبال نے اردو کو چھوڑ کر فارسی شعر گوئی کے لیے انحراف کیا۔ ان کے فلسفہ حیات کا ساری اسلامی دنیا اور جرمنی میں چرچا ہو گیا۔ اس دور میں نظمیں کم ہیں :

اقبال کے اس درخشاں دور میں شاعری میں حکیمانہ اسلوب اور ڈرامائی عنصر نمایاں ہے۔ کلام میں سادگی، ندرت، تمثیل نگاری، رموز و علائم کا استعمال اور صوت و آہنگ کا اہتمام ہے۔ بال جبریل کے اشعار میں ڈرامائی عنصر کا مؤثر اور دلنشیں انداز دیکھیے:

اک رات ستاروں سے کہا نجم سحر نے
آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار
کہنے لگا مریخ ادا فہم ہے تقدیر
ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کی سزاوار
زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں کیا
اس کرمک شب کور سے کیا ہم کو سروکار
بولا مہ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی
تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار
واقف ہو اگر لذت بیداریٔ شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پراسرار
آغوش میں اس کے وہ تجلی ہے کہ جس سے
کھل جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار
ناگاہ فضا بانگ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دل کہسار

اگرچہ اقبال انگریزی ادب کے کیٹس اور براؤننگ کی طرح ڈرامہ نگار شاعر نہیں ہیں مگر ان کی شاعرانہ عظمت میں ڈرامائیت کی جھلک چھائی ہوئی ہے۔ سادگی الفاظ اور بلند خیالی کی مثال دیکھیے:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

خودی کا نشیمن تیرے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اس زمانے میں اقبال نے بصیرت افروز فارسی تصانیف اسرار خودی اور رموز بے خودی ، پیام مشرق تحریر کیں ۔

جہاں تک آخری دور کے کلام میں رموز و علائم کا تعلق ہے تو سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ اقبال کی نظر میں خودی کا استحکام اور تکمیل منصب انسانیت ہے ۔ انسان آخر اطاعت اور ضبط نفس کے مراحل سے گزرتا ہوا نائب الٰہی کے مقام جلیل تک پہنچ جاتا ہے ۔ انسان کامل کا درجہ حاصل کرنے تک اقبال شاہین ، قلندر ، درویش ، بندۂ آزاد اور مرد مومن کے کلمات علامتوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔ نظر ، دید اور ذکر کی علامتیں وجدان بصیرت اور عشق کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔ فکر اور خبر کی علامت سے استدلالی عقل اور خرد مراد ہے ۔ اشعار کے آئینے میں اقبال کے دیگر رموز و علائم مثلاً نے نوازی ، پروانہ و جگنو ، لالہ اور شاہین اس طرح سے جلوہ گر ہیں ۔ مثلاً نے نوازی شاعری ہے :

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور نے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے یا چوب نے

گل لالہ ابتدائی شاعری میں محض خوبصورت اور خوش رنگ پھول ہے ۔ فطرت کا یہ حسین مظہر ، اب لالۂ صحرائی میں بدل گیا اور اس سے مراد حجاز کی مخصوص تہذیب ہے ۔ کچھ ہی عرصے بعد لالہ معنوی لحاظ سے امت محمدی کی علامت بن گیا ۔ یہ علامت ایک قدر میں ڈھل گئی ۔ لالۂ صحرا نامی نظم کے اشعار ہیں :

تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی اک لذت یکتائی
اے باد بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دلسوزی ، سرمستی و رعنائی

شاہین کی علامت کی وضاحت اقبال نے ان الفاظ میں کی : ''اس پردے میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں ۔ دراصل لفظ شاہین

حرکت رفعت پرواز اور قوت کی رمز ہے۔ نظم شاہین کے اشعار بے مثال ہیں :

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا ، پلٹنا ، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ

اقبال کی شاعری میں قلندری اور درویشی تکمیل انسانیت کی دو منزلوں کے نام ہیں۔ درویشی کے مرحلے پر اقبال انسان کو تفکر کی خاطر خلوت نشیں بنا لیتا ہے۔ وہ قلندر کی نسبت کم عمل ہے ، قلندر عاشق الٰہی ہے ، مگر راکب زمانہ بھی ہے - دونوں کی مثالیں دیکھیے :

اے حلقۂ درویشاں وہ مرد خدا کیسا
ہے جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز

اور پھر :

مہر و مہ انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

مرد مومن اور انسان کامل کے کردار کی عظمت دیکھیے :

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

اقبال کی نظمیں مسجد قرطبہ ، ذوق و شوق اور جاوید نامہ معنی خیزی کے علاوہ صوت و آہنگ کا بہترین نمونہ ہیں۔

جب تک کوئی شاعر شعور اور تجربے کی پختگی کو نہ پہنچے ، رباعی

نہیں کہہ سکتا ۔ اقبال کی رباعیات ارمغان حجاز اور بال جبریل میں تسکین ذوق کا باعث ہیں :

تیرا تن روح سے ناآشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نا رسا ہے
تن بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

اقبال کے نزدیک انسان کی خودی کا ثبات عشق کے ذریعے ممکن ہے اور اس کی تربیت بھی اس کی مرہون منت ہے ۔ عشق انسان کا وہ مرکزی نقطہ یا قوت معرکہ ہے جو اسے با عمل اور با مقصد بناتی ہے ۔ ضرب کلیم میں علم و عشق کے عنوان سے نظم بے نظیر ہے :

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

آگے چل کر فرماتے ہیں:

عشق دم جبریل عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام

عشق کی وسعتیں بے پناہ ہیں :

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

۱۹۰۸ء سے اقبال کی غزلیں ہر اعتبار سے فنی حسن اور تغزل سے مالا مال ہیں ۔ انہوں نے غزل کو نئی سمتیں اور عظمتیں عطا کی ہیں ۔ مثال کے طور پر غزل کی غنائیت ، تازگی اور رعنائی دیکھیے :

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ

میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں میرا ان کا سامنا کیوں کر ہوا

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

عشق الٰہی کی سرشاری اور قربت کا یہ حال ہے کہ اقبال خدا سے
ی شوخی سے بات کرتے ہیں ۔ یہ عام انسان یا شاعر کے بس کی بات نہیں :

تیری خدائی سے ہے میرے جنون کو گلہ
اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو

ی شوخی اور ناز و ادا کے بعد احساس بندگی کا عالم دیکھیے :

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزومندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

مجموعی طور سے کلام اقبال کے سارے ادوار پر نظر ڈالنے سے اندازہ
وتا ہے کہ اقبال کے نزدیک فلسفہ خودی کا حقیقت بننا یا خودی کی
کمیل انسانیت کا منصب ہے ۔ ان کے مخصوص فکری نظام اور شاعرانہ
تاد طبع میں میل اور ہم آہنگی ہے ۔ شاعری کے تیسرے اور آخری دور
یں اقبال کا کلام اسلامی ممالک ، چند یورپین ممالک اور برصغیر ہند و
ک میں گھر گھر پڑھا اور سمجھا جاتا تھا ۔ ادب کے طالب علم کے لیے
سندر ہے سیرابی مشکل اور ریاض طلب ہے ۔ اقبال کی شاعری فکر بلند
ر جذبہ عمیق کا حسین امتزاج ہے اور وہ تجریدی بھی ہے اور کلاسیکل
ھی ۔ اقبال نے دنیائے ادب کو ایک زندہ و جاوید فکری نظام اور
صور حیات بخشا ہے اور اس کی بدولت ہمارا نیکی اور انسانیت کی قدروں
ـ ایمان تازہ ہوتا رہتا ہے ۔

اقبال ذہنی ارتقا کے سفر میں جو دعا اپنے لیے کر گئے وہ تو
نے سن لی ہے :

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو

کاش کہ ہماری زندگی کا کارواں اقبال کی دکھائی ہوئی منزل مقص
کی طرف چل پڑے۔[1]

---

۱ - مقالات ، اقبال دوسری بین الاقوامی کانگرس منعقدہ ۹ تا ۱۱ نو
۱۹۸۳ء ، جلد اول ، جامعہ پنجاب لاہور ، ص ۴۷ تا ۶۳ -

اقبال اور عظمت آدم

عظمت آدم کا تصور ہمیشہ سے اہل دانش کے فکر و نظر کا مرکز و
ور رہا ہے - یونان کا مشہور حکیم اور فیلسوف دیو جانس کلبی روز روشن
ں چراغ لے کر اس عظیم انسان کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہا جو
ل صوری اعتبار سے نہیں بلکہ معنوی حیثیت سے آدم کہلانے کا مستحق
- انسان کی شکل و صورت میں دام و دد کے قبیل سے نہ ہو اور نہ
شت و بربریت کی بہیمانہ صفات کا حامل ہو بلکہ آدمیت کی بنیادی
صوصیات اور اس کے اساسی کمالات کا مظہر ہو -

علامہ اقبال کے پیر رومی نے جو خود عظمت آدم کے بہت بڑے
غ اور شارح تھے - یونانی حکیم کی اس داستان کو نظم کر یوں نقش دوام
نا ہے :

دی شیخ با چراغ ہمے گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

خود مولانا رومی علیہ الرحمۃ کے ہاں عظمت آدم کا ایسا اعلیٰ و ارفع
ور موجود ہے جو زمین گیر بھی ہے اور آسمان گیر بھی ، فرشتہ صید
ی اور یزدان شکار بھی :

بزیر کنگرہ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و ملائک شکار و یزداں گیر

عظمت آدم کا تصور صدیوں سے نہ صرف ایک شعری روایت
اعتبار سے بلکہ ایک فکری تحریک کی حیثیت سے شعری ادب کا لازمی
رہا ہے اور قدیم شعرا نے کہیں براہِ راست اور کہیں بالواسطہ طو
اس روایت کو آگے بڑھایا ہے - حافظ شیرازی تخلیق آدم کے تذکر
ضمن میں فرماتے ہیں :

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ بھی فرماتے ہیں کہ کارکنان قضا و قد
ابر و باد ، مہ و خورشید کو شب و روز کی گردش پیہم پر اس لیے
کر رکھا ہے کہ یہ انسان کے معاشی مسائل میں ان کی معاونت کری

حافظ شیرازی کے ہاں انسان کی عظمت کا تصور اس قدر واضح اور
ہے کہ وہ گدایان عشق کے ایک ایک فرد کو شاہان کجکلاہ کے
خیال کرتے ہیں :

مبین حقیر گدایان عشق را کین قوم
شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

برِ صغیر پاک و ہند میں تقدس آدمیت کے تصور کو ملا ظہو
نظیری نیشا پوری ، مرزا بیدل اور غالب نے نہایت دلفریب اور پر
انداز میں آگے بڑھایا ہے - ملا ظہوری نے مقام آدمیت کی رفعت کا
عشق کی تلمیحات کے پردے میں کیا ہے - وہ اس کائنات کو عشق
پیشہ کی ایک ایسی نادر شکار گاہ خیال کرتا ہے جہاں کبک خوشخ
شاہباز کو شکار کرنے پر مستعد و آمادہ نظر آتا ہے :

سخن صید گہ عشق مپرس
کبک اینجا بہ صید باز آید

فطرت کو زیر کرنے اور تسخیر کائنات کے عمل کو تیز تر کرنے کا تذکرہ ظہوری نے جس حکیمانہ انداز میں کیا ہے وہ اپنی جگہ پر لامثال ہے۔ ملا ظہوری منفی قوت کے ذریعے ایک مثبت طاقت کا مظاہرہ کرنے پر کمربستہ نظر آتا ہے لیکن ایسا کرنے کے لیے وہ زور بازو کا سہارا لینے کی بجائے عجز و انکسار کے ذریعے سر پنجہ قدرت کو مروڑنے کا عزم جوان رکھتا ہے:

می توان سر پنجہ قدرت بزور عجز تافت
عشق چون صیاد شد کنجشک برباز افگم

مرزا غالب نے اس خیال کو نیا رنگ اور آہنگ دیا ہے۔ غالب کے کلام میں عرفان ذات کے ساتھ تکمیل ذات اور تسخیر کائنات کے مختلف تصورات بہ تمام و کمال موجود ہیں۔ غالب انسانی ذہن سے اس خیال کو محو کر دینا چاہتا ہے کہ وہ کائنات کا ایک حقیر ذرہ ہے بلکہ اگر وہ اپنی حقیقت سے آشنا ہو جائے تو وہ قطرہ ہی نہیں بلکہ سرتاپا ایک بحر بیکراں بھی ہے:

از وہم قطرگی است کہ در خود گمیم ما
اما چو وا رسیم ہمان قلزمیم ما

مرزا غالب بنی نوع انسان سے ہمدردی و محبت ہی کو انسانیت کی معراج قرار دیتا ہے:

کمال درد دل اصل است در ترکیب انسانی
بخون آغشتہ اند اندر تن ہر موئے جانے را

تخلیق آدم کی بنیادی غایت کے تحت ہی کائنات عالم وجود میں آئی اس لیے وجود آدم ہی دراصل گردش لیل و نہار کا مرکز و محور ہے:

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بگرد نقش ما دور ہفت پرکار است

یونان کے دیو جانس کلبی ، اقبال کے پیر رومی ، ملاظہوری نظیری نیشا پوری اور مرزا بیدل سے لے کر مرزا غالب کے ہاں جس بلن مرتبت اور رفیع الشان انسان کا تصور ملتا ہے اس کے جملہ خد و خال علامہ اقبال کے مردِ مومن اور مردِ قلندر سے ملتے جلتے ہیں ۔ اس عظیم ت انسان کے مقامات بھی بلند ہیں اور مقاصد بھی ارفع و اعلیٰ ۔ اس کے اند بے پناہ قوتِ ارادی اور غیرمعمولی عزم تسخیر موجود ہے ۔ اس لیے اس کی روح کی پہنائیوں میں پوشیدہ بے پناہ قوتِ عمل کے سامنے صحرا سرنگوں اور دریا جبیں سائی کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ اقبال کے مومن کا عزم جوا آسمانوں کی گردش بدل دینے پر قادر اور قضا و قدر کی قوتوں کو ہر آن دعوت مبارزت دینے پر آمادہ نظر آتا ہے :

بیا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم
قضا بگردش رطل گران بگردانیم

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اسی کاروانِ خیال کے سب سے آخری مگر تلخ نواحدی خوان ہیں جس نے عظمت آدم اور احترام آدمیت کے بلند آہنگ ترانے الاپے ہیں ۔

انسان عظیم ہے اور اس کی زندگی کے مقاصد بھی اعلیٰ و ارفع ہیں ۔ ظاہر ہے کہ نصب العین اور مقاصد جس قدر بلند ہوں گے ان کے حصول کے لیے اسی تناسب سے جہد و کوشش درکار ہو گی کیونکہ کسی بلند آدرش کے حصول کے لیے غیرمعمولی استقامت اور مثالی عزم و ثبات کے ساتھ سعی پیہم اور کردار و عمل بنیادی شرط کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اس لیے اقبال نے ہمارے سامنے حصول نصب العین کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ تکمیل ذات کے ساتھ تسخیر کائنات کا آئینہ دار ہے :

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال نے عالم انسانیت کو اس جہان آب و گل سے بلند ہو کر اعلیٰ و ارفع مقامات تک رسائی حاصل کرنے کا درس دیا ہے :

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

اقبال نے عالم انسانیت کے سامنے ایک پرجوش انقلابی تصور پیش کر کے اسے اس بات پر ابھارا ہے کہ وہ اپنی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بساط عالم میں ہر لمحہ ایسی تبدیلی پیدا کرے جو معاشرہ کو اس کے بلند مقاصد سے ہمکنار کر دے:

ہر نفس کہ برآری جہاں دگرگوں کن
دریں رباط کہن صورت زمانہ گزر

لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے اقبال کے پاس یقین محکم، عمل پیہم اور سعی مسلسل کے ماسوا اور کوئی چارہ کار نہیں:

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال نے نوآبادیاتی نظام کے ساتھ ملوکیت اور دوسری سامراجی اور استحصالی قوتوں کے گٹھ جوڑ کو انسان کی روحانی، اخلاق اور معاشی و معاشرتی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا ہے اور ان غیر قدرتی حالات کے خلاف عوام کے اجتماعی شعور اور ان کی عملی قوتوں کو منظم کرنے پر بڑا زور دیا ہے۔ اقبال نے ان رکاوٹوں کا نہ صرف سائنسی تجزیہ کیا بلکہ ان کے خلاف منظم طور پر نبرد آزما ہونے کی راہ بھی ہموار کی اور شہنشاہیت کے خلاف اپنا سارا زور بیان صرف کیا:

ابھی تک آدمی صید زبوں شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

اقبال نے نوآبادیاتی نظام پر بھی ہمیشہ بھرپور وار کیا ہے اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف محکوم قوموں کو منظم و متحد ہو کر جدوجہد کرنے کی تلقین کی ہے:

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیہ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

حکیم الامت کے خیال میں سیاسی آزادی کے بغیر مذہب و اخلاق بے روح اور بے معنی الفاظ ہو کر رہ جاتے ہیں :

در غلامی عشق و مذہب را فراق
انگبین زندگانی بدمذاق

شاعر مشرق ، معاشرتی عدم مساوات اور معاشی ناہمواری کے خلاف مسلسل برسر پیکار رہے اور دہقان اور زمیندار کے معاملہ میں ہمیشہ :

دہ خدایا یہ زمین تیری نہیں میری ہے
تیرے آبا کی نہیں میری نہیں تیری نہیں

کا نعرہ بلند کیا ۔ تاجر و مزدور کے تضیہ میں بھی مفکر اسلام اقبال خواہ ناکردہ کار کے خلاف مزدور کے حق میں صدا بلند کرتے رہے :

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

اقبال اس بے کراں جہان رنگ و بو کے مقابلہ میں مومن کے جہان کو کہیں زیادہ لامحدود وسعتوں کا حامل جہان بتاتا ہے اور پورے یقین و اعتماد کے ساتھ کہتا ہے کہ :

ع   مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے

اقبال نے اپنے آفاق پیغام میں مومن مسلمان اور قلندر کو ایک تصویر کے تین روپ کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کی منزل سرحد ادراک سے دور اور بہت دور بتاتی ہے :

ع   پرے ہے سرحد ادراک سے منزل مسلماں کی

اقبال نے مومن کی شناخت کی نشانیاں بھی بتائی ہیں ۔ فرماتے ہیں :

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

حضرت اقبال ایک اور جگہ مومن کی صفات عالیہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبال کے خیال میں جب تک انسان صداقت، شجاعت اور عدالت کی صفات اپنے کردار و عمل میں پوری طرح نہ سموئے گا اس وقت تک اس امانت کے تقاضوں کو پورا نہ کر پائے گا، جو آسمان اور پہاڑوں کے مقابلہ میں اس نے اپنے کندھوں پر اٹھائی تھی:

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

غرض یہ کہ انسان دوست اقبال نے نہ صرف انسانی عظمت کے گیت گائے ہیں بلکہ رنگ و نسل، ملک و وطن اور مذہب و ملت کے امتیازات سے بلند ہو کر انسان دوستی کے چراغ بھی روشن کیے ہیں۔ نژاد نو کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

حرف بد را بر لب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلق خداست
آدمیت احترام آدمی
با خبر شود از مقام آدمی
بندہ عشق از خدا گیرد طریق
مے شود بر کافر و مومن شفیق

اقبال سے پہلے جن دانش وروں نے عظمت آدم کے حامل انسان کو برسوں تلاش کیا اسے انہوں نے پایا یا نہیں لیکن اقبال اپنی جستجو میں ضرور کامیاب ہوئے۔ انہوں نے اپنی اس کامیابی کا ان الفاظ میں اعتراف کیا:

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مشکل کے بعد آخر یہ شاہین زیر دام آیا[1]

۱۔ مقالات اقبال، دوسری بین الاقوامی کانگرس منعقدہ ۹ تا ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء، جلد اول، جامعہ پنجاب لاہور، ص ۲۳۹ تا ۲۴۴۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین

اقبال کی غزل گوئی

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشہ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

اس شعر میں اقبال نے اپنی غزل کی دو خصوصیات بیان کی ہیں۔ پرسوز و نشاط انگیز۔ اگر دیکھا جائے تو یہی دو باتیں غزل کی بنیادی خصوصیات قرار پاتی ہیں۔ ہر بڑے غزل گو کے ہاں کبھی یہ دو باتیں ایک جا ملتی ہیں اور کبھی صرف ایک چیز پائی جاتی ہے۔ حافظ کی غزل نشاط انگیز ہے میر کی پرسوز ہے۔ غالب کے ہاں سوز و نشاط دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ سوز و نشاط سے ہم مراد کیا لیتے ہیں، ان کی تشریح و تفسیر کس طور سے کرتے ہیں تو اس پر سوچنے کی ضرورت ہے۔ اصل مسئلہ ان کے لغوی معنوں کو بیان کرنے کا نہیں، بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ سوز اور نشاط کی کن کیفیتوں کو شاعر کا کلام پیش کر رہا ہے۔ ان دو لفظوں کی تعبیر اور معنویت کی سطح کا تعین خود شاعر کے کلام، اس کی فکر اور جذبے کی سطح کو دریافت کرنے کے بعد ہی ممکن ہے، عشق کا موضوع ہر غزل گو کے یہاں مل جاتا ہے مگر ہر غزل گو اس موضوع کو اپنی مخصوص فکر اور احساس کے مطابق پیش کرتا رہا ہے۔ میر مختلف ہیں، مومن کے یہاں عشق کا رنگ کچھ اور ہے — داغ نے اسے ایک دوسری سطح دی ہے۔

چنانچہ اقبال کے یہاں بھی سوز و نشاط کی کیفیت دوسرے شعرا کے مقابلے میں مختلف نوعیت رکھتی ہے — اقبال کی ابتدائی غزلوں کو چھوڑ کر وہ غزلیں جو اردو میں بال جبرئیل اور فارسی میں زبور عجم میں پائی جاتی ہیں ایک منفرد آواز — اور ایک منفرد فضا کو پیش کرتی ہیں۔ اقبال

کی غزلیں اُن کے نظامِ فکر اور ان کی نظموں سے کسی طرح بھی مختلف نہیں ہیں — وہی لہجہ، وہی احساس، وہی اندازِ فکر اور وہی زندگی کے رازِ سربستہ کی جستجو :

عالمِ آب و خاک و باد ، سرِ عیاں ہے تو کہ میں ؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں ، اس کا جہاں ہے تو کہ میں ؟
وہ شبِ درد و سوز و غم کہتے ہیں جس کو زندگی
اس کی سحر ہے تو کہ میں؟ اس کی اذاں ہے تو کہ میں؟
تو کفِ خاک و بے بصر! میں کفِ خاک و خود نگر
کشتِ وجود کے لیے ، آبِ رواں ہے تو کہ میں ؟

ان مصرعوں میں جو گونج ہے وہ آفاق کے رازِ نہاں کی اس کبھی نہ ختم ہونے والی جستجو کی نشان دہی کرتی ہے جو ازل سے آدم کا مقدر ہے۔ اس کے علاوہ ان اشعار میں وہ "سوز" بھی ہے جو اقبال کے کلام میں نئی معنویت اور فکری امکانات کے ساتھ مسلسل پایا جاتا ہے۔ یہ "سوز" کسی مجہول اور منفعل غم کا نہ سبب ہے نہ غماز۔ اس میں پسپائی اور جہدِ حیات سے گریز کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ یہ اس گداز دل پر دلالت کرتا ہے جس کے بغیر آدمی فکر اور احساس سے محروم رہتا ہے اور رازہائے حیات کی جستجو کی راہیں اس پر بند ہو جاتی ہیں۔ اقبال کی پرسوز آواز طہارتِ نفس اور علوِ فکر کی آواز بن جاتی ہے۔ اس میں تغزل ہے ، انسانی دردمندی ہے اور عشق کا الم نصیب سفر ہے۔ اقبال کی غزلوں کا خاص وصف وہ رچا ہوا تغزل ہے جو مسائلِ حیات کو مسائلِ عشق بنا دیتا ہے :

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت وہ نگہ کا تازیانہ
مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ
مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے ، تب و تابِ جاودانہ

اور یہ اشعار بھی سنیے :

کیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر ، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں ، حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

ان اشعار میں وہ سب کچھ ہے جسے ہم غزل کہتے ہیں — یہ تغزل کی بلند ترین روایات کے حامل ہیں - مگر ان کا لہجہ ، ان کا انداز نظر دوسرے اشعار سے یکسر مختلف ہے - ان کی عشقیہ شدت کی کیفیت بھی مختلف ہے — یہ ایک عظیم ہجر کے اشعار ہیں — وہ ہجر جو خود آدمی میں ہے — اپنی ذات کے شعور تک نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے — وہ ہجر جو کائنات کے مسائل کے ادراک کو نہ حاصل کر سکنے کی وجہ سے ہے — وہ ہجر جو خدا سے جدائی کی بنا پر ہے :

تو ہے محیط بےکراں ، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہم کنار کر ، یا مجھے بے کنار کر
باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے ، اب مرا انتظار کر

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کسک سی جو ہے سینے میں غم منزل نہ بن جائے

اقبال کی غزلوں میں یہ پرسوز آواز ہمیں بار بار ملتی ہے - یہ سوز و گداز ہمارے اندر رموز کائنات کی گرہ کشائی اور اپنی ذات سے شناسائی کا جذبہ پیدا کرتی ہے -- اردو شاعری میں تغزل کی یہ نئی جہت ہے -

اب ذرا اس نشاط انگیزی کو دیکھ لیجیے جو لذت جستجو اور نگاہ حسن بیں سے پیدا ہوتی ہے :

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن ؟

چند اشعار اور دیکھیے :

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لا الہ الا ھو
میں نو نیاز ہوں ، مجھ سے حجاب ہی اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو
جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

یہ قلندرانہ جذب و مستی کی شاعری ہے جو حجاب کائنات اُلٹتی جاتی ہے - جس پر حسنِ زندگی آشکار ہوتا جاتا ہے - اس میں عشق کی وہ دیدہ دری پائی جاتی ہے جو پوری کائنات کو "حسنِ ازل" کی نمود بنا دیتی ہے -

اقبال کا یہ متغزلانہ لہجہ ، یہ حسن شناس نظریہ ، یہ فکری بلندی ان کی پوری شاعری میں ملتی ہے - کچھ غزل ہی کی تخصیص نہیں ہے ، ان کا کلام ایک غزلِ مسلسل ہے - مشکل ہی سے کوئی نظم ایسی ہوگی جس میں غزل کا جادو نہ ہو ، شکوہ ، جواب شکوہ کے بند کے بند ، غزل ہیں :

تیری محفل بھی گئی ، چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں ، صبح کے نالے بھی گئے

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو ، وہ کلی نہیں ملتی

یہ ان کی ''نظم حضور رسالت مآب[3] میں'' کا ایک شعر ہے - ''شمع اور شاعر'' کا یہ شعر بھی سنیے :

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بال جبرئیل کی نظموں کے چند اشعار بھی سنیے:

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ، ہجر میں لذت طلب
گرمئی آرزو فراق ، شورش ہائے ہو فراق
موج کی جستجو فراق ، قطرے کی آبرو فراق

یہ اشعار اقبال کی مشہور نظم ذوق و شوق سے ہیں ، اب ایک آخری شعر مسجد قرطبہ کا بھی دیکھیے ۔ یہ نظم شاعری کا اعجاز ہے ۔ ہسپانیہ کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر ، آج بھی ہیں دل نشیں

تغزل اقبال کے کلام کا مخصوص مزاج ہے ۔ وہ کہیں بھی الگ نہیں ہوتے ، ان کے مصرعے ساز کے تاروں کی طرح نغمگی سے لبریز ہیں:

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

ان کی غزلوں میں ارض و سما کا حسن سمٹ آیا ہے اور وہ زندگی کا حسن بن گئی ہیں ، جب رات ڈھل جائے ، تارے ماند ہونے لگیں ، تمام دن چلنے والے راستے سونے لگیں اور سائے خاموش گلیوں کی دیواروں سے اتر کے چپکے چپکے خواب گاہوں میں داخل ہونے لگے ــــ تو اس وقت اقبال کی غزل دلوں کو ٹٹولتی اور آہستہ سے وہ دریچہ کھولتی ہے ــــ جہاں زندگی اپنی تمام بیگانہ وشی کو بھول کر کھڑی ہوتی ہے اور آشنا زبان میں گفتگو کرنے لگتی ہے:

مجھے آہ و فغان نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

ــــــ

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم
فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں

تارے آوارہ و کم آمیز
تقدیر وجود ہے جدائی
یہ پچھلے پہر کا زرد رو چاند
بے راز و نیاز آشنائی
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمود سیمیائی

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے یہ مکاں کہ لا مکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی
اسی کشمکش میں گزریں، مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

اس آواز میں کتنا رس، کتنا سوز، کتنی موسیقی ہے، یہ کتنی پراسرار آواز ہے — رات کی اس انتھاہ خاموشی میں یہ کس سے مخاطب ہے؟ صعود و ہبوط کا یہ سفر کیا ہے، کیوں ہے؟ — کیا یہی حاصل وجود ہے؟ شعور حیات ہے، آخر کیا ہے؟:

وہ حرف راز جو مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں

اقبال کی غزلوں میں شعور ذات، احساس کائنات اور رمز حیات ہے۔ یہ مہر و ماہ کی طرح گردش میں ہیں — یہ غزلیں ہر عہد کی تاریخ کو دیکھتی آدمی کے ساتھ سفر میں ہیں — اور سفر ہجر — اقبال کی غزلیں آدمی کا دل بھی ہیں اور آدمی کا دماغ بھی:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

کہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود
کہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا، سینۂ کائنات میں

جدید غزل کا آغاز اقبال سے ہوتا ہے۔ ان غزلوں میں عقل و
کی تمام حکایتیں درج ہیں۔[1]

---

۱ - ماہنامہ آموزش، کوئٹہ، نومبر ۱۹۸۴ء، ص ۷ تا ۱۰۔

حمید نسیم

اقبال اور ملی احیاء

اقبال کی ایک معروف غزل کا آخری شعر ہے :

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

شعر کے پہلے مصرعہ میں جس احساس کا اظہار ہے وہ قاری کو کلام اقبال میں جگہ جگہ ملتا ہے ، لیکن اس احساس کو کسر نفسی پر محمول نہ کرنا چاہیے - ہر عظیم ادب کا فنکار اپنی تخلیق کا سب سے بڑا ناقد بھی خود ہوتا ہے - اقبال کو اس حقیقت پر پوری آگہی تھی کہ وہ آفاق عظمت کے شاعر ہیں - چنانچہ ایک آدھ جگہ اپنے آپ کو شاعر مشرق بھی کہتے ہیں - بات دراصل یہ تھی کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کا کلام قاری کی جمالیاتی خاطر اندوزی تک محدود ہو جائے اور لوگ اُن کی کتابوں کو دیوان حافظ کی طرح فال نکالنے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیں -

اقبال کی شاعری پوری کائنات کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے - محض فنی محاسن اور حسن اسلوب کی داد سے زیادہ کا تقاضا رکھتی ہے - ان کی فکر اور ان کے نظریہ حیات کو سمجھنے کے لیے ان محرکات اور اثرات کا ادراک ضروری ہے ، جن سے یہ مرتب ہوئے -

اقبال کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما گزشتہ صدی کے اواخر میں شروع ہوئی - یہ زمانہ انگریز ملوکیت کے سطوت و جلال کا زمانہ تھا - انگریز اسلامی سلطنت کو ہٹا کر برصغیر پر پوری مطلق العنانی سے حکمران ہو چکے تھے - مسلمان ایک ہزار سال کی حکومت کے بعد سیاسی زبوں حالی اور اقتصادی تباہی کا شکار تھے - سرسید اور مولانا حالی نثر و

نظم کے وسیلے سے مایوس ملت کے دل میں ایک نئی اُمنگ پیدا کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ ان کی اس جدوجہد سے اسلامی نشاۃ الثانیہ کے آغاز کی کچھ صورت پیدا ہو رہی تھی۔

اسی زمانہ میں آل انڈیا کانگریس ملک میں سیاسی اصلاحات حاصل کرنے کے لیے کوشش کر رہی تھی۔ اقبال کے ذہن پر سرسید و حالی کے ملی جہاد نے بھی اثر کیا اور کانگریس کی سیاسی تحریک نے بھی، چنانچہ اقبال کی شاعری کے حصہ اول میں جہاں اسلامی نظمیں ملتی ہیں، وہاں نیا شوالا، میرا وطن وہی ہے اور سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا جیسی نظمیں بھی ہیں جن میں جذبات نگاری کی بھی کمی نہیں، یہ اقبال کی ذہنی بلوغت کے آغاز کا دور تھا۔

موجودہ صدی کا آغاز تمام عالم اسلام کے زوال کا پیغام لے کر آیا مغربی استعمار نے ایک ایک کر کے تمام اسلامی مملکتوں کو تاراج کیا اور تمام اسلامی ملت غلام ہو کر رہ گئی۔ دنیائے اسلام کی تخریب اور تباہی کے اس عظیم سانحے نے اقبال کو نئے زاویے اور نئی وسعت عطا کی اب انھیں محسوس ہوا کہ ان کا کرب محض مقامی نہیں، ہمہ گیر ہے مسلمان صرف برصغیر میں ہی خوار و زبوں نہیں، تمام دنیا میں فلاکت ادبار میں مبتلا ہیں۔ تمام مشرق، مغربی استعمار کے شکنجے میں ہے چنانچہ اقبال نے مغربی استعمار کے خلاف جہاد شروع کیا اور تمام دنیائے اسلام کو ملی احیا اور قومی خود آگہی کی نوید دی۔ جنگ طرابلس میں مسلمانوں کے تہور کی روداد حضور رسالت مآبؐ میں یوں پیش کرتے ہیں

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

وہ مسلمانوں کی زبوں حالی کو اسلامی "نشاۃ الثانیہ کا وسیلہ"
سمجھتے ہیں :

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی ؐ سے شرار بولہبی

امت محمدی ؐ کی ہر آزمائش ایک نئی فتح مبین کا پیش خیمہ ہوتی ہے :

"ظہور مصطفوی ؐ را بہانہ بولہبی است"

یہ دور اقبال کی فکر اور اقبال کی تخلیقی کاوشوں کے کمال کا دور ہے
ب ان کی نگاہ جغرافیائی اور سیاسی سرحدوں کو طے کر چکی ہے - اب وہ
ام عالم اسلام کے شاعر ہیں اور جہاں ملت کو جغرافیائی یا سیاسی
رحدوں میں بند کرنے کی کوشش ہوتی ہے اقبال فوراً اس کی برملا تکذیب
رتے ہیں - اقبال کی فکر ارتقا کے مراحل طے کرتے ہوئے منزل آگہی
ک آئی تو انہیں ان کے دل نے خبر دی کہ ان کا اصل موضوع انسان ہے
سان جو فرزند آدم ہے - - - انسان جو نائب الٰہی ہے ، انسان جو خلیفتہ
نہ فی الارض ہے ، جو مقصد تخلیق کائنات ہے ، جس کے جوہر کی نمود کے
ے خیر و شر کی جنگ برپا کی گئی ، جس کی سہولت کے لیے وقت کے دھارے
روز و مہ و سال کے بند باندھے گئے - اس مقام فکر پر پہنچ کر اقبال
ک ، نسل ، مقام اور عقیدت کے بت توڑ دیتا ہے اور پکار اٹھتا ہے :

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

یہاں مرکزی لفظ دنیا ہے - اقبال نے یہ نہیں کہا کہ اٹھو پھر سے
مرق کے غریبوں کو جگا دو - یہ بھی نہیں کہا کہ اٹھو مری ملت کے
ریبوں کو جگا دو -

یہاں اقبال انسان کو خدا کی حضوری کا شرف عطا کرتا ہے ، جو
بال کے نظریہ خودی کے مطابق انسان کی معراج ہے - یہاں کارل مارکس
ے متعلق کہتا ہے :

صاحب سرمایہ از نسل خلیل
یعنی آں پیغمبرے بے جبرئیل

ختم نبوت کے بعد پیغمبر یے جبرئیل سے برتر کوئی مقام نہیں ۔ اب طاہرہ قرۃ العین جیسے بدعت کی پاداش میں علمائے وقت نے گردن زدنی قرار دیا ، ارواح جلیلہ میں شامل ہے اور جاوید نامے کی عرش اقلیم میں منصب جلیلہ پر فائز ہے ۔

اب اقبال کا سیاسی نظریہ یہ تھا کہ ملوکیت اور استعمار نے بنی نوع انسان کو اقتصادی طبقات میں بانٹ کر رکھ دیا ہے اور جب تک یہ طبقاتی امتیازات قائم ہیں ، انسان خدا کے مقرر کیے ہوئے منصب پر نہیں پہنچ سکتا اور بنی نوع انسان سرمایہ دار ملوکیت کے جبر کی وجہ سے دین برحق سے دور رہنے پر مجبور ہے اور خلافت الٰہی سے محروم ہے۔ اقبال کی ایک مختصر سی نظم ہے :

''الارض للہ'' جس کا ایک شعر ہے :

سینچتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد شرط خیز

اقبال کی فکر کے سیاسی پہلو پر ذرا تفصیل سے بات اس لیے کی گئی ہے کہ عام قاری کا براہ راست تعلق اسی سے ہے اور اس پر اعتراض بھی کرتے ہیں اور ناسمجھی کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ اقبال کی فکر میں تضاد بہت پایا جاتا ہے ۔ اگر وہ اقبال کی فکر کے ارتقا کا صحیح جائزہ لیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اقبال کی فکر کی ابتدا وطن پرستی سے ہوئی اور انسان پرستی پر آ کر اپنی انتہا کو پہنچی ، لیکن کوئی عظیم مفکر صرف سیاسی نظریات تک ہی محدود نہیں رہتا ، سیاسی محرکات انسانی زندگی پر ہر وقت اثر انداز ہوتے رہتے ہیں ، اسی لیے ان سے مفر نہیں ، لیکن ان محرکات کے علاوہ اور اہم عوامل بھی ہیں ، کچھ وسوسے ، کچھ غم ، کچھ اضطراب ، کچھ مسائل ، کچھ تمنائیں ایسی بھی ہیں جو وقت و مکان کی قید سے بالا ہیں ۔ رنگ ، نسل ، قومیت ، عقیدت اور طبقاتی کشمکش کی چھوٹی حقیقتوں کی دنیا سے آگے بھی ایک عالم ہے اور یہی عالم وہ ہے جس کے متعلق اقبال کہتے ہیں :

آگ بجھی ہوئی ادھر ، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کاروان

آتی ندائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہل فراق کے لیے عیش دوام ہے یہی

اقبال کی فکر کے فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی پہلو پر بات آجاکر نہیں جا سکتی ۔ اقبال نے مشرق و مغرب کے تمام تر ادب و فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا :

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

وہ بھرتری ہری ہوں کہ محی الدین ابن العربی ، رازی ہوگئے ہرگساں ، ہگل یا نطشے ، علم و آگہی کی یہ نہریں قرآن کے بے پایاں اور بے کنار سمندر میں آکر مل گئیں ۔

اقبال نے رومی کو اپنا مرشد بنایا اور قرآن کو رومی کے نقطۂ نظر کی روشنی میں سمجھ کر اپنا لیا اور پھر ہر طرف رنگ رنگ کی تتلیوں کا نظارہ تھا ۔ ازلی اور ابدی حقیقتیں صرف دو ہیں ، ذات الٰہی اور انسان جو نائب الٰہی ہے ۔ انسان خود آگاہ نہ ہو تو وقت آج اور کل ، شب و روز اور دیروز کی آماجگاہ ہے ۔

انسان خود آگاہ ہو تو پھر دوام ایک لمحۂ ساکت ہے : ایک زمانہ رو جس میں دن ہے نہ رات ۔ انسان کی معراج ذات الٰہی میں مدغم ہونا نہیں یہ وحدانیت تصوف ہے ۔ قربت و وصال کی حد یہ ہے کہ قاب قوسین اوادنیٰ ۔ منزل مراد فنا فی اللہ نہیں خودی کی بقائے دوام ہے ۔ عیش دوام وصال نہیں فراق ہے ۔ فراق میں تہذیب ذات اور سچی انا کے عرفان کا وسیلہ ہے ۔

اقبال کے ہاں روحانی ، اخلاق ، جمالیاتی اقدار کی صداقت کا ایک ہی معیار ہے ، وہ اقدار اور اجماع کہ منزل عرفان کی طرف لے جائیں ، جو اسے خود آگہی سے دور لے جائیں ، وہ پروردۂ ابلیس ہے ۔

ان اقدار کی جانب صرف اشارہ کیا جا سکتا ہے ۔ مولانا روم ایک

جگہ کہتے ہیں: میں قرآن پڑھتا ہوں تو اپنے آپ کو محبت انبیاء میں پاتا ہوں۔

کلام اقبال کتاب الٰہی کی دل افروز تفسیر ہے، عرفان الٰہی کا تابناک سمندر ہے، مسلسل غواصی کے بغیر اس کے جمال و جلال کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

بقول اقبال:

اگر ہو ذوق تو فرصت میں پڑھ زبور عجم[۱]

۱۔ ماہنامہ' آموزش، کوئٹہ، نومبر، دسمبر (محسن انسانیت نمبر و سالنامہ) ۱۹۸۷ء، ص ۲۵۹ تا ۲۶۰، ۲۹۲۔

بلوچ ادبی شخصیات اور علامہ اقبال

علامہ سر محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے - (یہ تاریخ حکومت پاکستان نے ۹ نومبر ۱۹۷۵ء کو تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق قرار دی ہے) - ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا جو بڑے دیندار انسان تھے - علامہ اقبال نے ابتدائی خانگی تعلیم کے بعد سکاچ مشن سکول سیالکوٹ سے میٹرک امتیاز کے ساتھ پاس کیا پھر عربی و فارسی کے متجر عالم شمس العلماء مولوی میر حسن کی تعلیم نے ان میں اعلیٰ علمی و ادبی ذوق پیدا کیا - ایف - اے کا امتحان پاس کرنے پر وظیفہ ملا - پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں بی - اے میں داخلہ لیا - بی - اے کرنے کے بعد ۱۸۹۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم - اے کی ڈگری لی - تھوڑے وقت کے لیے گورنمنٹ کالج میں معاشیات ، فلسفہ اور تاریخ کے استاد رہے - ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے - پی - ایچ - ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں واپس وطن آئے اور وکالت شروع کی - ۱۹۳۴ء تک وکالت کرتے رہے - ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ آف برطانیہ نے سر کا خطاب دیا - ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں تاریخی خطبہ الہ آباد پڑھا - ۱۹۳۱ء میں لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی - ۱۹۳۳ء میں سید سلیمان ندوی کے ساتھ نادر شاہ کی دعوت پر کابل گئے -

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں وفات پائی اور شاہی مسجد کے جنوبی جانب دفن کیے گئے - قوم نے انھیں حکیم الامت کا خطاب دیا -

علامہ اقبال نے اردو اور فارسی زبان میں اشعار کہے ہیں - فارسی میں ان کا کلام اردو کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے - علامہ کے فارسی شعری مجموعے درج ذیل ہیں : ۱- اسرار خودی - ۲- پیام مشرق - ۳- زبور عجم -

۴- رموز بے خودی - ۵- جاوید نامہ اور ۶- پس چہ باید کرد اے اقوام شرق - اس کے علاوہ علامہ اقبال کے اردو شعری مجموعے درج ذیل ہیں :
۱- بال جبریل - ۲- ضرب کلیم - ۳- بانگ درا - میرے پیش نظر علامہ مرحوم کی سوانح حیات یا ان کے کلام پر اظہار خیال نہیں بلکہ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علامہ مرحوم کو بلوچستان میں بھی بہت قبولیت حاصل ہوئی ہے اور بلوچستان کی ادبی شخصیات نے علامہ اقبال کو نہ صرف خراج عقیدت پیش کیا ہے بلکہ ان کے کلام کا بلوچی میں ترجمہ کر کے علامہ کے نظریات اور خیالات سے اہل بلوچستان کو آگاہ کیا ہے۔ ان میں سے چند کا تذکرہ پیش ہے -

۱- عطا شاد

عطا شاد صاحب بلوچستان کے سیکرٹری ثقافت اطلاعات و کھیل ہیں - اردو اور بلوچی کے عظیم شعراء میں آپ کا شمار ہے اور صاحب دیوان شاعر ہیں - عطا شاد صاحب نے علامہ اقبال کی بہت سی نظموں کا بلوچی میں ترجمہ کیا ہے - عطا شاد نے علامہ اقبال اور بلوچستان پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں بلوچستان کے پس منظر میں اقبال کی شاعری کا جائزہ لیا گیا تھا -

۲- ڈاکٹر عبدالرحمان براہوی

ڈاکٹر عبدالرحمان صاحب ، براہوی کے مشہور ادیب و محقق ہیں - آپ نے براہوئی اور اردو میں تقریباً بیس کتابیں لکھی ہیں - ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال پر ایک کتابچہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے "علامہ محمد اقبال" جسے براہوی اکیڈیمی کوئٹہ نے ۱۹۷۸ء میں کوئٹہ سے شائع کیا - اس کتابچہ میں علامہ اقبال کی شاعری کے خاص خاص پہلوؤں کا جائزہ مختصراً لیا گیا ہے - اس کے علاوہ "بلوچی دنیا" ملتان میں بھی موصوف کا ایک مضمون "علامہ اقبال سے ایک ملاقات" کے عنوان سے چھپا تھا - ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال پر بہت تحقیق کی ہے -

۳- میر مٹھا خان مری

میر مٹھا خان مری کا نام بلوچستان کے ادبی حلقوں میں تعریف و

تعارف کا محتاج نہیں ۔ آپ نے علامہ اقبال کے کلام اور افکار کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا اور علامہ کے افکار و نظریات سے آگاہی حاصل کی ۔ آپ نے ایک کتاب بلوچی میں بھی لکھی ہے جو علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات ولادت ۱۹۷۷ء میں پیش کی گئی اور پاکستان رائٹرز گلڈ سے انعام یافتہ ہے ۔ کتاب کا نام ہے درگال ِ اقبال ۔

۴۔ ملک محمد رمضان بلوچ

آپ بلوچ اکیڈیمی کے سابق چیئرمین اور اخبار "ساربان" مستونگ کے ایڈیٹر ہیں ۔ ملک صاحب نے علامہ اقبال کے کلام کا اچھی طرح سے مطالعہ کیا ہے ۔ ملک رمضان بلوچ نے علامہ اقبال کے کلام کا منظوم بلوچی ترجمہ بھی پیش کیا ۔ علامہ اقبال کی مشہور نظم ''بوڑھے بلوچ کی نصیحت اپنے بیٹے کو'' جس کا ترجمہ ملک محمد رمضان نے بلوچی زبان میں کیا ہے جس کا عنوان ہے :

پھیریں بلوچ' نصیحت وتی بچھا

۵۔ پیر محمد زبیرانی

پیر محمد زبیرانی صاحب نے بلوچی اور براہوی شعر و ادب کے میدان میں خاصا کام کیا ہے ۔ آپ نے علامہ اقبال پر بہت کچھ لکھا ہے اور مزید لکھنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں ۔

۶۔ نادر قمبرانی

آپ براہوئی اور بلوچی زبان کے مقبول ادیب ہیں ، اور بلوچستان یونیورسٹی میں براہوی کے لیکچرار بھی ہیں ۔ علامہ اقبال پر آپ کے دو مضمون خاصے مشہور ہیں :

۱۔ براہوی ادب پر علامہ اقبال کے اثرات ۔

۲۔ علامہ اقبال اور بلوچی ادب

نادر قمبرانی نے دوسری بین الاقوامی ڈاکٹر محمد اقبال کانگریس منعقدہ لاہور ۹ تا ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء میں اسی موضوع پر مضمون پیش کیا تھا ۔

۷۔ غوث بخش صابر

غوث بخش صابر ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں بلوچی کے پروڈیوسر ہیں غوث بخش صابر صاحب بلوچی میں علامہ اقبال کے بارے میں لکھتے رہتے ہیں ۔ اقبال سے متعلق احمد ندیم قاسمی کے ایک کتابچہ کا بلوچی ترجمہ غوث بخش صابر نے علامہ اقبال کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر کیا ۔ غوث بخش صابر نے علامہ اقبال کی کئی غزلوں کا ترجمہ حسن و خوبی سے کیا ہے ۔

ان کے علاوہ اور بہت سے بلوچ ادیبوں نے علامہ اقبال پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے اور بہت سے قلمکاروں نے علامہ اقبال کی نظموں کا ترجمہ کیا ہے جن میں صورت خان مری ، غنی پرواز ، اسحاق سوز ، نور محمد ہمدم محمد حسین عنقا ، ملک محمد طوق ، عبدالخالق بلوچ ، مومن بزوار ، عبدالرحیم صابر ، فاطمہ مینگل ، عبدالقادر اسیر ، الفت نسیم ، عبدالرحمان غور ، حبیب اللہ رند ، اسحاق شمیم ، مولوی خیر محمد ندوی ، محمد حیات ، حاجی عبدالقیوم بلوچ ، محمد خان مری ، عبدالمجید مینگل ، میر محمد آلفت ، عبدالوہاب جنک ، ظفر مرزا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ جن کے مضمون زیادہ تر ''اولس بلوچی کوئٹہ'' میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ ان حضرات نے اقبال ، اقبال اور خودی ، اقبال کا فلسفہ ، اقبال کی زندگی ، اقبال کے کارنامے ، اقبال کی نظموں کے ترجمے ، اقبال اور قومیت ، اقبال اور بلوچستان ، اقبال اور اس کی شاعری ، اقبال اور اسلام ، اقبال کی دعا اقبال اور ہمارے شاعر وغیرہ جیسے عنوان اپنے مضامین کے لیے منتخب کیے اور ان پر مضامین لکھے ہیں ۔ بلوچستان میں علامہ اقبال پر جو تحقیق ہو رہی ہے اور بلوچستان کے ادیب علامہ کے افکار و نظریات پر جو کام کر رہے ہیں وہ نہ صرف قابل قدر ہے بلکہ ان کی تعلیمات کو بلوچستان میں عام کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے ۔[1]

---

۱ ۔ ماہنامہ 'آموزش' کوئٹہ ، نومبر ، دسمبر (محسن انسانیت نمبر و سالنامہ) ۱۹۸۷ء ، ص ۲۸۹ تا ۲۹۱ ، ۲۹۵ ، ۲۹۶ ۔

اسی موضوع پر مزید تفصیلات کے لیے یہ کتاب ملاحظہ کیجیے :
علامہ اقبال اور بلوچستان ، ڈاکٹر انعام الحق کوثر ، ناشر : علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، اسلام آباد ، ۱۹۸۶ء ۔

امداد نظامی

شمع اور شاعر

اقبال کی شہرۂ آفاق نظم ''طلوع اسلام'' کے ابتدائی بند کا ایک شعر ہے:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

یہ شعر مغربی استعماریت کی چیرہ دستیوں کے ذہنی، نفسیاتی اور سیاسی رد عمل کے طور پر عالم اسلام میں رونما ہونے والی عام بیداری اور غلامی سے نجات کی امنگ کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن اس وسیع تر مفہوم کے ساتھ ساتھ یہی شعر اس بے مثال تاریخی شعور اور تاریخ ساز فکری و ذہنی انقلاب کی ترجمانی بھی کرتا ہے جس سے اقبال خود یورپ کے سفر کے دوران ہمکنار ہوئے۔ ۱۹۰۵ء تک، یعنی یورپ کے سفر پر روانگی سے قبل تک وہ وطن پرستی، ہندوستانی قومیت اور بین المذاہب یکجہتی و اتحاد کے حامی اور مبلغ دکھائی دیتے ہیں۔ ''ہندوستانی بچوں کا گیت''، ''نیا شوالہ'' اور ''ہمالہ'' ان کے اسی انداز فکر کی علامتیں ہیں۔ لیکن سفر یورپ اور وہاں سے واپسی پر بعض مسلم ممالک کی سیاحت نے ان میں یہ شعور بیدار کیا کہ صرف ہندی مسلمان ہی غلامی اور زبوں حالی سے دوچار نہیں، پورا عالم اسلام اپنے تابناک ماضی سے کٹ کر غلامی، پسماندگی اور بے دست و پائی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس مشاہدے اور شعور نے ان کو وطنیت اور وطنی قومیت کی محدود سوچ سے نکال کر ملی احساس کی وسیع تر فضاؤں سے روشناس کیا اور اس طرح وہ ایک ہندوستانی قومی شاعر کے بجائے عالم اسلام اور پوری ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والے ملی شاعر کی حیثیت سے ابھرے اور یہی اس ہمہ گیر اور

ہردم رواں ہردم جواں انقلاب کا نقطہ آغاز تھا جو ان کی ذات ، ان کے افکار اور ان کی حرکت و عمل سے لبریز شاعری کے طفیل ملت اسلامیہ میں رونما ہوا - ان کی نظم ''شمع اور شاعر'' اسی تاریخ ساز فکری انقلاب کی علامت ہے اور کلام اقبال میں اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ اس کی تخلیق کا زمانہ سفر یورپ سے واپسی کے فوراً بعد کا زمانہ ہے - یعنی یہ نظم ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی اور اس کے ذریعہ اقبال کے افکار میں ابھرنے والے تند و تیز انقلاب کا اظہار پوری شدت کے ساتھ اس طرح ہوا کہ اس سے نہ صرف حالات و واقعات کے اسباب و علل ، محرکات اور تاریخی پس منظر پر روشنی پڑتی ہے اور اصلاح احوال کے لیے رہنما اصولوں کی نشاندہی ہوتی ہے ، بلکہ مایوسی اور زبوں حالی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں یہ نظم امید و آرزو اور عزم و اعتماد کی روشنی کا سرچشمہ بھی ثابت ہوتی ہے -

اس فکری پس منظر کے ساتھ ساتھ ''شمع اور شاعر'' ایک شاہکار فن کی حیثیت سے بھی نہایت دلکش اور اثر آفریں نظم ہے اور اپنے شعری حسن اور فنکارانہ محاسن کے اعتبار سے نہ صرف اردو کے شعری ادب میں ممتاز مقام کی حامل ہے ، بلکہ عالمی ادبی سرمائے میں بھی نہایت ارفع مقام کی حامل تصور کی جاتی ہے -

اس نظم کی سب سے نمایاں خوبی اس کی ڈرامائیت ہے - نظم ایک بے حد اہم موضوع پر کہی گئی ہے - شاعر چاہتا تو براہِ راست اس پر گفتگو شروع کر سکتا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلوب کے اس راست انداز کے ساتھ بھی یہ نظم بڑی دلکش اور فکر انگیز ثابت ہو سکتی تھی - لیکن شاعر نے اسے زیادہ پرکشش ، زیادہ بامعنی اور زیادہ اثر انگیز بنانے کے لیے ایک اچھوتا ڈرامائی اسلوب اختیار کیا جس نے نہ صرف نظم کی جاذبیت کو بڑھا دیا بلکہ اہم فکری موضوعات پر بات کرنے کے ایک نئے اور زیادہ بامعنی اسلوب کی بنیاد بھی استوار کر دی -

یہ نظم ایک مکالمے کی صورت میں سامنے آتی ہے - اس مکالمے میں دو افراد شامل ہیں ، شمع اور شاعر - شمع ہماری شعری روایت میں ابتدا

ہی سے روشنی اور سوز و گداز کی علامت رہی ہے ، لیکن اس نظم میں یہ روایت وسیع تر مفہوم کے ساتھ یوں سامنے آتی ہے کہ شمع ، روشنی اور سوز و گداز کے ساتھ ساتھ خود شاعر کی روشنیٔ طبع اور اس کے افکار و خیال ، تجربے اور مشاہدے اور ان سب عوامل کے فلسفیانہ تجزیے کی علامت بن کر ابھرتی ہے اور شاعر جو کچھ خود کہنا چاہتا ہے وہ اس کی زبانی یوں کہلواتا ہے کہ اظہار و بیان کی یہ صورت کہیں زیادہ خوبصورت اور اثر انگیز بن جاتی ہے ۔

نظم کا آغاز شمع سے شاعر کے مکالمے سے ہوتا ہے ۔ بظاہر وہ اپنی ذات کے حوالے سے چند سوالات پیش کرتا ہے ، لیکن یہ سوالات حقیقتاً اس کی ذات تک محدود نہیں بلکہ اس کی ذات میں کروٹیں لیتے اضطراب و اضطرار کے حوالے سے پوری ملتِ اسلامیہ پر پھیلے ہوئے ہیں :

دوش می گفتم بہ شمع منزل ویران خویش
گیسوئے تو از پر پروانہ دارد شانہٴ
در جہاں مثل چراغ لالۂ صحراستم
نے نصیب محفلے ، نے قسمت کاشانہٴ
مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم
در طواف شعلہ‌ام بالے نہ زد پروانہٴ
می طپد صد جلوہ در جان امل فرسود من
بر نمی خیزد ازیں محفل دل دیوانہٴ
از کجا ایں آتش عالم فروز اندوختی ؟
کرمک بے مایہ را سوز کلیم آموختی !

میں نے اپنے ویران گھروندے میں جلنے والی شمع سے کہا ، تیری زلفوں کی آرائش تو پر پروانہ سے ہوتی ہے ایک میں ہوں کہ اس دنیا میں میری حیثیت صحرا میں کھلنے والے گل لالہ کے چراغ کی سی ہے ۔ نہ میری قسمت میں کوئی محفل ہے نہ کسی کا گھر ۔ تیری طرح میں نے بھی ایک عمر جلتے ہوئے گزاری ہے ، لیکن کسی پروانے کو میرے شعلے کا طواف کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ۔ میرے پیکر میں ہزاروں حرارت بخش جلووں کی نمود ہے ، لیکن کوئی بھی ان جلووں کی امنگ لے

کر ابھرنے والا دکھائی نہیں دیتا ۔ آخر تو نے یہ آتش عالم فروز کہاں سے حاصل کی ہے جس نے ایک حقیر کیڑے کے اندر سوز کلیم پیدا کردیا ہے ؟

شاعر کے ان سوالات کے بعد شمع کا جواب شروع ہوتا ہے جو اس نظم کے دس بندوں پر پھیلا ہوا ہے ۔ پہلا بند شمع اور شاعر کے سوز مشترک کے حوالے سے دونوں کے باہمی تضاد کا تجزیہ کرتا ہے :

میں تو جلتی ہوں کہ مضمر ہے مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا
گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفان اشک
شبنم افشاں تو کہ بزم گل میں ہو چرچا ترا
اور ہے تیرا شعار ، آئین ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

یہ تجزیہ اور تقابلی مطالعہ قومی و ملی تقاضوں سے وسیع تناظر میں شاعر کے منصب اور بنیادی فریضے کی نشاندھی کرتا ہے ۔ وہ بھی محض ایک تذکرے کے طور پر نہیں بلکہ اتنی شدت کے ساتھ کہ اس کے جذبہ و احساس کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے ۔ یہاں سے بات بتدریج آگے بڑھتی ہے ۔ فکری ارتقا غیر محسوس لیکن انتہائی سائنٹیفک انداز میں شاعر کو مرکزی نقطہ بنا کر ان تمام المیوں ، سانحوں ، عملی و فکری کوتاہیوں اور ان کے نتیجے میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کا تجزیہ پیش کرتا ہے اور اس طرح بات اس المیہ تک پہنچتی ہے کہ :

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

زیاں سے بڑھ کر المیہ احساس زیاں کا ختم ہونا ہے ۔ اس لیے اگلا بند اس کی تشریح کرتا ہے ۔ لیکن اقبال چونکہ بنیادی طور پر حرکت و عمل کے پیغامبر ہیں ، انسان کو قنوطیت کے بجائے رجائیت کا پیغام دینا چاہتے ہیں اور تمام تر شکست و ریخت کے باوجود ایک عزم تازہ کا درس دینا ضروری تصور کرتے ہیں ۔ اس لیے اس بند کے آخری شعر میں وہ صورتحال کی المناکی سے عہد آیندہ کی امیدوں کی جانب گریز کرتے ہیں :

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی

اور پھر اگلا بند اس طرح شروع ہوتا ہے :

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

اور اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے :

نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش
در غم دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی ، دار گوش
کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفل ملت کو پیغام سروش
آنکھ کو بیداری دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوز جوہر گفتار سے

اس شعر سے شاعر کے لیے نظام فکر و اظہار کی ترتیب شروع ہوتی ہے اور بطور خاص ان تباہ کن اثرات کا تذکرہ ہوتا ہے جو اپنی اصل سے غفلت ، جمعیت سے گریز اور خود مرکزیت کا نتیجہ تھے :

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی ، دنیا میں رسوا تو ہوا

اور پھر اس بند کا آخری شعر ایک ازلی و ابدی کلیے ، اصول اور قانون کو واضح کرتا ہے اور یہی اس نظم کا بنیادی نکتہ ہے :

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اس کے بعد نظم اپنے کلائمکس کی طرف بڑھتی ہے ۔ شاعر کو اس کے اصل منصب سے انتہائی اثر انگیز انداز میں روشناس کرایا جاتا ہے ۔ اس کو علامت بنا کر محفل ہستی میں مرد مسلماں کے منصب کو اجاگر

کیا جاتا ہے اور اس طرح اس کی خوابیدہ صلاحیتوں اور توانائیوں کو بیدار اور متحرک کیا جاتا ہے :

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو ، کھیتی بھی تو ، باراں بھی تو ، حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو ، رہرو بھی تو ، رہبر بھی تو ، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو ، بحر تو ، کشتی بھی تو ، ساحل بھی تو

اور پھر اس بند کا آخری شعر ہے :

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

نواں بند اسی کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے ۔ بند کیا ہے ایک سیل حرکت و عمل ہے جو قاری کے رگ و پے میں بجلیاں بھرتا ہوا گزرتا ہے ۔ خوابیدہ روحوں کو جھنجوڑ کر بیدار کرتا ہے اور شکستہ پا راہرووں کو منزل کا عزم عطا کرتا ہے ادر جب عزم و عمل ، یقین و اعتماد اور جرأت و بیداری کی یہ فضا مکمل رعنائی کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے تو پھر ایک نئی تابناک صبح کی نوید سامنے آتی ہے :

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

دیکھ لو گے سطوت رفتار دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی

اور پھر نظم کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے :

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

یہ نوید حقیقت بن کر مطلع زندگی پر نمودار ہو چکی ہے - لیکن اقبال کے پیغام کی تکمیل ابھی باقی ہے - جلوۂ خورشید کو مطلع حیات سے محفل حیات میں آتارنا اور چمن کو حقیقی معنی میں نغمۂ توحید سے معمور کرنا مسلسل حرکت و عمل اور جرأت و استقامت کا تقاضا کرتا ہے - ملت اسلامیہ نے افکار اقبال کو چراغ راہ بنا کر اپنا عرفان حاصل کر لیا ہے ، لیکن اپنی عظمت رفتہ کو مکمل طور پر بحال کرنے کے لیے اس چراغ کی حیات آفریں روشنی میں ابھی کئی منزلوں کا سفر باقی ہے - یہ سفر طے ہو گیا تو وہ منزل بھی آ جائے گی جب ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکیں گے کہ :

شب گریزاں ہو چکی ہے جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہے اب نغمۂ توحید سے

(۱۰ - ۱۱ - ۱۹۸۵ء)

جاوید اقبال

اقبال اور خودی

جس عظیم شخصیت کے بارے میں یہ خیالات قلم بند کیے جا رہے ہیں وہ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ اس صدی کے عظیم مفکر اور سیاستدان بھی تھے ۔ دنیا کے بڑے بڑے مدبر ان کے تبحر علمی ، عالی دماغی اور دوراندیشی کے معترف و مداح ہیں ۔ ان کے کلام اور پیغام کے یوں تو بے شمار پہلو اور گوشے ہیں جن پر بہت سے اہل نظر اور اہل خبر روشنی ڈالتے رہتے ہیں مگر مجھے جس بات میں اقبال کا کمال اور معجزۂ فن نظر آیا وہ اس کا پیش کردہ نظریہ خودی تھا ، جس کے ذریعے وہ زندگی کے معمے کو حل کرتے ہیں اور ایک مکمل اور قابل عمل نظام حیات پیش کرتے ہیں ۔ ابتداً لوگوں نے اس کو محض شاعرانہ اختراع اور مجذوب کی بڑ قرار دیا ۔ مگر اقبال کے مداحوں نے اس کا جواب یوں دیا کہ اقبال کے نظریۂ زندگی کا جوہر ان کا تصور خودی ہے اور یہ تصور ان کے پیغام و کلام میں اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح خدا کائنات کی ہر شے میں موجود ہے ۔ اقبال نے اس شدت اور جذبے سے اس نظریے کو بیان کیا کہ ان پر اس نظریے کے موجد ہونے کا گمان ہوتا ہے ۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے ۔ غالباً سقراط پہلا دانشور ہے جس نے علوم و فنون کی بنا اسی نظریے پر قائم کی ، یعنی انسان اپنے آپ کو پہچانے ۔ سترھویں صدی میں فرانسیسی مفکر ڈی کارٹ نے اس کی تبلیغ کی ۔ اسلامی صوفیائے کرام بھی اس تصور سے بیگانہ نہ تھے ، لیکن اقبال کا کارنامۂ خاص یہ ہے کہ اس نے اسے عملی صورت دی اور غلام قوم کے لیے اس تشخیص نے وہ کام کیا جو بسااوقات زندگی بچانے کے لیے کیا جاتا ہے ۔

خودی کے دو معنی ہیں ایک غرور ، نخوت اور تکبر ۔ دوسرا انفرادیت ، انا ، من ، خود شناسی اور عرفان ذات وغیرہ ۔ اقبال اسے

وحدت و وجدان اور شعور کے روشن نقطے سے تعبیر کرتا ہے ، اس کے خیال میں تخیلات و تعینات اس سے منور ہوتے ہیں ۔ یہ پراسرار شے ہر چیز میں موجود ہے ، مگر اس کی لطافت مشاہدے میں نہیں آ سکتی :

ہر چیز ہے محو خود نمائی
ہر ذرہ شہید کبریائی

بے ذوق نمود ، زندگی ، موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی

برصغیر میں انگریزوں کے اقتدار سے بہت پہلے تک نفی خودی یعنی خود کو کمتر اور حقیر سمجھنے کا خطرناک رجحان عام تھا ، جس نے عرصۂ دراز تک اقوام مشرق کو ذلیل کیے رکھا ۔

اس نظریہ کے علمبرداروں میں ابن عربی پیش پیش تھے نیز ہندوستان میں شری شنکر کے منطقی ذہن نے اسے مزید گنجلک بنا دیا ۔ صوفیوں کا خیال ہے کہ خودی بلکہ حقیقت اشیا ایک واہمہ ہے اور انسان کی مثال ایک حقیر قطرے کی سی ہے ۔ سمندر میں فنا ہونا ہی اس کی تقدیر ہے ، انسانی انفرادیت کوئی چیز نہیں اور اس میں ترک عمل نے انسان کو بے کار محض بنا دیا ۔ افلاطون کے اس نظریے نے مشرقی اقوام کو روحانی بلندیوں سے قعر مذلت میں لا گرایا ۔ چنانچہ علامہ نے اس کے خلاف آواز بلند کی ۔ وہ اپنے رسالے اسلام اور احمدیت میں تحریر فرماتے ہیں ۔ اس (تصوف) نے عامتہ الناس کی رگوں کو مردہ کر دیا اور عوام مختلف قسم کے توہمات کا شکار ہو گئے ۔ روحانی تعلیم دینے والا تصوف ختم ہو چکا ہے اور لوگوں کی جہالت و کمزوری سے فائدہ حاصل کر رہا ہے ۔

اقبال نے اس طرز عمل کے خلاف جہاد کیا ، ان کے نزدیک خودی واہمہ نہیں بلکہ حقیقت ہے اور اپنی انفرادیت کو فنا کر دینے سے نہ صرف انسان خود مٹ جاتا ہے بلکہ جب یہ نظریہ قوموں کے دلوں میں گھر کرلے تو قومیں فنا اور ذلیل و خوار ہو جاتی ہیں ۔

ان کے نزدیک خودی اپنے آپ کو پہچاننے کا نام ہے ۔ چنانچہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا :

"جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا"

اسی لیے انھوں نے تصوف کا ذہن کے نقش گر اول یعنی افلاطون کی مذمت کی ۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

راہب دیرینہ افلاطون حکیم
از گروہ گوسفندان قدیم
گفت سر زندگی در مردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است

برصغیر کے مسلمانوں کے بالخصوص خواب سے بیدار کرنے اور قومی حمیت کو جھنجوڑنے کے لیے افلاطونی دیو مالائی نظریے کی نفی ضروری تھی اور علامہ نے بروقت اس کا نوٹس لیا ۔

اب ملاحظہ فرمائیے خودی کے مدارج ۔

علامہ کے ہاں خودی کی تین منزلیں ہیں ۔ پہلا مرحلہ اطاعت الٰہی کا ہے اور دوسرا ضبط نفس کا ، تیسرا اور آخری نیابت خداوندی کا ۔ یہاں پہنچ کر انسانی خودی کی تکمیل ہو جاتی ہے اور وہ نادر ترین خودی سے رابطہ استوار کر چکتی ہے ۔ اطاعت الٰہی یعنی قانون فطرت کی پابندی سے مراد یہ ہے کہ چونکہ خدا کی بنائی ہوئی ہر شے میں قانون فطرت جاری و ساری ہے اور یہ تمام کائنات ایک قانون کے تحت کام کر رہی ہے ۔ سورج ، چاند ، ستارے ، زمین ، آسمان غرضیکہ تمام مظاہر قدرت سب ایک صاحب حکم کے زیر نگیں ہیں ۔ پس انسان پر بھی لازم ہے کہ وہ قانون فطرت کی اطاعت کرے اور مقررہ حدود میں رہ کر ارتقائی کوششیں کرے ۔

ارتقاء خودی کا دوسرا مرحلہ ضبط نفس ہے ، یہ خودی کی بڑی بلند منزل ہے ۔ اس میں انسان اپنے دل کو کدورت ، رعونت اور آلائشوں سے پاک و صاف کرتا ہے ، کمینے اور سفلی جذبات سے بچتا ہے اور ان پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے ۔ خوف لالچ وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے اور ایک خاص شان استغنا پیدا کر لیتا ہے ، حق گوئی و بے باکی کو شعار بنا

لیتا ہے ، فقر کے مفہوم کی عملی تصویر بن جاتا ہے ، دنیا کی کسی طاقت سے ذرہ بھر خوفزدہ نہیں ہوتا اور زہر ہلاہل کو قند نہیں کہتا ، صداقت کا پرستار بن جاتا ہے ۔ خواہشات پر قابو پا لیتا ہے اور اپنے آپ کو سمجھنے اور اپنے مقصد تخلیق کو سمجھنے کی سعی کرتا ہے ۔

خودی کا آخری مرحلہ نیابت الٰہیہ ہوتا ہے ، جب ضبط نفس کا مرحلہ طے ہو جاتا ہے تو انسان مومن کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے ، واضح رہے کہ اقبال مومن کو عام معنوں میں نہیں لیتا ۔ اس کے نزدیک مومن وہی ہے جو خودی کے پہلے دو مرحلوں کو طے کر کے آخری تکمیلی مرحلے میں داخل ہو جائے اور جو اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے کائنات کی قوتوں سے برسر پیکار ہو کر ان پر غالب ہو جائے اور نوادر فطرت کو اپنے زیر نگیں کرے اور اس کی اقبال نے یہ پہچان بتائی ہے :

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

اس منزل میں داخل ہونے کے بعد انسان میں خدا جیسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ صاحب فقر و عشق ہو جاتا ہے اور اسی فقر و عشق اور بے نیازی سے تمام مصائب و مشکلات پر قابو پا لیتا ہے اور خدائے بزرگ و برتر کا دست قدرت اور زبان بن جاتا ہے ، یہی صحیح معنوں میں خدا کا نائب اور خلیفہ بن جاتا ہے اور اسی خلافت کے بارے میں خدا نے اپنی کتاب میں فرمایا :

انی جاعل فی الارض خلیفہ

ایسے انسان کی زندگی خالصتاً اللہ کے لیے ہوتی ہے اور وہ واقعی انسان کا رہبر بن جاتا ہے ، اس کی سلطنت خدا کی حکومت ہوتی ہے اور یہی اقبال کا مرد کامل ، مرد مومن ، مرد فقیر ، قلندر ہے اور اسی کی شان میں اقبال یوں رطب اللسان ہے :

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں ، کار کشا ، کارساز
خاکی و نوری نہاد ، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی ، اس کا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل ، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب ، اس کی نگہ دل نواز

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کو حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

اقبال خودی کی زندگی میں اپنی زندگی پاتا ہے اور اس کی موت کو اپنی موت سمجھتا ہے ۔ اس کے نزدیک کسی ایسی چیز کا وجود قابل تسلیم نہیں جو "میں ہوں" نہ کہہ سکے :

سخن از بود و نابود جہاں با من چہ می گوئی
من این دانم کہ من ہستم ، ندانم این چہ نیرنگ است

وہ ہمیشہ خودی کی حفاظت پر زور دیتا ہے اور اس کی بقا میں حیات دوام کا راز پوشیدہ پاتا ہے ، اس لیے جو شخص قوانین قدرت کو تسخیر کرے ، اس میں خودی محکم بالذات جذب ہو جاتی ہے اور وہ مرد کامل بن جاتا ہے ، اور اقبال کے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے عمل سے خدائی صفات اپنے اندر پیدا کرے ۔ اقبال کے اس نظریے سے مشرقی اقوام کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور ان پر جو بے حسی و بے چارگی اور بے فکری کی سی جو کیفیت طاری تھی ، دور ہوتی جا رہی ہے ۔ توکل اور تقدیر زدہ لوگ عمل کو اپنا شعار بنا رہے ہیں ۔ ترک دنیا اور ترک عمل کا نظام منسوخ ہوتا جا رہا ہے اور آرزو ، جستجو ، عمل پیہم ، یقین ، سفر اور حرکت کی تعلیم عام ہو رہی ہے ۔

لہذا اقبال کو ایسا مجدد کہہ سکتے ہیں ، جس نے تعبیر خیالات کے ذریعے ایشیا کو پستی سے بلندی کی راہ پر گامزن کیا ۔

---

۱ - ماہنامہ "آموزش" ، کوئٹہ ، نومبر ، دسمبر ۱۹۸٦ء ، ص ۱۹ تا ۲۱ ، ۳٦ -

اقبال اور نظام مملکت

تاریخ اسلام اس بات کی شاہد ہے ، کہ جب جب اور جہاں جہاں ایک مفکر اور ایک مدبر صفحۂ ہستی پر ظہور پذیر ہوئے ۔ انھوں نے کچھ ایسے پائیدار اور گہرے نقوش چھوڑے کہ جن کی بنا پر تاریخ عالم ایک نئے موڑ سے دوچار ہوئی ۔ ارسطو اور سکندر ، ملٹن اور کراسویل ، روسو اور نپولین ، مارکس اور لینن اس کلیہ کا بین ثبوت ہیں ۔ بعض مرتبہ مدبر نے مفکر کے فکر کو عملی جامہ پہنایا ، اس کی سوچ کو حقیقت میں تبدیل کیا ، اس کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا ، اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ مدبر نے نام تو مفکر کا لیا لیکن اس نے فکر کو غلط جامہ پہنایا ۔ لینن نے اشتراکی نظام رائج کیا لیکن انقلاب فرانس کا جنازہ نپولین کے کاندھوں پر اٹھا ۔

اس بیسویں صدی میں بھی ایک مفکر پیدا ہوا اور ایک مفکر نے راہ دکھائی اور مدبر نے قوم کو اس راہ پر چلایا ۔ مفکر نے ایک خواب دیکھا اور مدبر نے اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دیا ۔ مفکر کے خواب کا تجزیہ کرنے کے لیے ہم اس کے دو حصے کر سکتے ہیں ۔ اول ایک خطۂ زمین پر ایک مملکت کا تعلق ہے ، سرسید احمد خان اور جمالدین افغانی اس کی طرف کچھ اشارے کر چکے تھے ۔ اقبال نے اسے الہ آباد کے مقام پر ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ نہایت واضح اور صاف الفاظ میں پیش کیا ہے ۔ اپنے اس خطبہ میں وہ بات ثابت کرنے کے بعد کہ برصغیر مختلف اقوام کا وطن ہے ، جن کی نسل ، زبان ، مذہب سب ایک دوسرے سے جدا ہیں ، مسلمانان ہند کے اس مطالبہ کو مبنی برانصاف قرار دیتے ہیں کہ برصغیر میں ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے ، اور پھر اس کے بعد فرماتے ہیں :

''ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں - میری خواہش ہے کہ پنجاب ، صوبہ سرحد ، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے ، خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے ، خواہ اس کے باہر مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی - - - - اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیے ، نہ ہندوؤں کو - ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے ، اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے ، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے -''

اس کے علاوہ انھوں نے اپنے متعدد خطوط اور خاص طور پر ان خطوط میں جو قائد اعظم کے نام رقم فرمائے ہیں ، اپنے اس مطالبے پر زور دیا ہے - اپنے خط مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں رقمطراز ہیں :

''اس ملک میں شریعت اسلامی کا نفاذ اور اس کی توسیع ایک آزاد مسلم مملکت یا چند مملکتوں کے بغیر ناممکن ہے -''

اسی طرح اپنے خط مورخہ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء میں لکھتے ہیں :

''ہندوستان میں قیام امن کی واحد راہ یہی ہے کہ نسلی ، مذہبی اور لسانی مماثلت کے لحاظ سے اس کی دوبارہ تقسیم عمل میں آئے -''

اسی خط میں آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں :

''مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے مراجعت سے قبل لارڈ لوتھیان نے مجھ سے کہا تھا کہ میری سکیم ہی ہندوستان کے درد کا واحد درمان ہے ، لیکن اس کے رو بہ عمل آنے میں پچیس سال درکار ہوں گے -''

لارڈو لوتھیان نے مسلم قوم کی صلاحیتوں کا اندازہ پوری طرح نہیں لگایا تھا کیونکہ اس اسکیم کے رو بہ عمل آنے میں پچیس سال سے بھی کم

عرصہ صرف ہوا ، اور بیس سال سے بھی کم عرصہ میں اس سکیم پر عمل درآمد کروایا گیا ۔ ان کے علاوہ بھی اقبال نے اپنی اس اسکیم کو متعدد مقامات پر پیش کیا ہے جن کے ذکر کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ۔

جہاں تک شعر اقبال کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے اپنے قیام یورپ ہی کے زمانہ میں ابتدائی طور پر اس نظریہ کو پیش کردیا تھا ۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ وہ وطنیت اور قومیت سے متنفر ہو رہے تھے ، اور خاک وطن کا ہر ذرہ اب انہیں دیوتا نظر نہیں آ رہا تھا ، بلکہ وہ اس راہ پر گامزن تھے جو ایک نئی قسم کی ہیئت اجتماعی کے قیام پر منتہی تھی اس ہیئت اجتماعی کی اساس تہذیب و تمدن تھے — نہ کہ جغرافیائی حدود اور نسلی اختلافات ، اس دو قومی نظریہ کا لازمی اور منطقی نتیجہ ایک نئی مملکت کے قیام کا مطالبہ تھا ۔

اب آئیے ، اس اسکیم اور مطالبہ کے دوسرے اہم پہلو کی طرف ، اور وہ ہے نظام مملکت ، اس ضمن میں ہماری توجہ سب سے پہلے ان کے مضمون ''اسلامی نظریہ' سیاسیات' پر مبذول ہوتی ہے جو انہوں نے ۱۹۰۸ء میں رقم فرمایا تھا ، اور ''سوشولوجی ریویو'' لندن میں شائع ہوا تھا (ترجمہ از راقم الحروف مطبوعہ ہمایوں ، لاہور - اپریل ۱۹۴۳ء) اس کے بعد دوسرا اہم مضمون وہ خطبہ جو انہوں نے ۱۹۱۰ء کے آخر میں اسٹریچی ہال ایم ۔ اے اردو کالج علی گڑھ میں دیا تھا اور جس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے بعنوان ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' ایک ایسے جلسہ میں پیش کیا جو لاہور میں ۱۹۱۱ء کے شروع میں منعقد ہوا تھا اور اس میں خود ڈاکٹر اقبال تشریف فرما تھے ۔ ''رموز بے خودی'' بہت حد تک اس موضوع پر ہے ۔ مختلف خطبات ، خطوط ، اور بیانات کے علاوہ آپ نے اکثر مسلسل نظموں اور مختلف اشعار میں نظام مملکت پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے ۔ اقبال صرف ایک مابعدالطبیعاتی مفکر ہی نہ تھے بلکہ سیاسیات میں بھی ان کی نظر بہت گہری تھی ، اس مضمون میں نہ اس بات کا موقع ہے اور نہ ہی ضرورت کہ مفصل طور پر ان کے سیاسی نظریات اور خیالات پیش کیے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ

یہ نظریات کیوں اور کس طرح ارتقاء کی مختلف منازل سے گزرے۔ میں یہاں صرف مختصراً وہ اہم نکات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جو ان کے لحاظ سے نظام مملکت میں بنیادی حیثیت کے مالک ہیں۔

اقبال زندگی کو ایک وحدت خیال کرتے ہیں۔ ان کے لحاظ سے زندگی کو کلیسا اور ریاست کے مختلف شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد ایک عالمگیر اصول پر رکھتے ہیں۔ یہ عالمگیر اصول مذہب اور اخلاق ہے۔ بنابریں وہ مملکت کی بنیاد مذہب اخلاق پر استوار کرتے ہیں، نہ کہ وطن، نسل، قوم، جغرافیائی حدود وغیرہ پر۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ، خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات — وہ مذہب اور سیاست کو دو شعبہ ہائے زندگی نہیں سمجھتے، بلکہ وہ انہیں ایک ہی حقیقت خیال کرتے ہیں۔ ان کے لحاظ سے مذہب — اور اخلاق ہماری تمام زندگی پر حاوی ہیں۔ وہ ہماری تمام زندگی میں جاری و ساری ہے۔ زندگی کو مذہب اور سیاست کے مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا:

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑا
چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین سیاست میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

موجودہ دور میں مذہب اور سیاست کی علیحدگی میکاولی اور مارٹن لوتھر کی بدولت عمل میں آئی۔ اس بنا پر اقبال ان دونوں کے خلاف ہیں۔ اول الذکر نے سیاست کو مذہب سے جدا کیا اور موخرالذکر

نے مذہب کو سیاست سے - میکاولی نے سیاست کی بنیاد مادیت پر رکھی، اور لوتھر نے مذہب کو روحانیت پر استوار کیا - روحانیت اور مادہ کی وہی تنویت تھی جو یورپ میں زمانہ قدیم سے چلی آ رہی تھی - اقبال اس تنویت کے سخت خلاف تھے :

تن و جاں را دوتا گفتن کلام است
تن و جاں را دوتا دیدن حرام است
کلیسا سبحہ پطرس شمارد
کہ او با حاکمی کارے ندارد
بدن را تا فرنگ از جان جدادید
نگاہش ملک و دیں را ہم دوتادید
خود را بادل خود ہم سفر کن
یکے بر ملت ترکان نظر کن
بہ تقلید فرنگ از خود رمیدند
میان ملک و دین ربطے ندیدند

"قانون اسلام میں ریاست اور کلیسا میں کوئی فرق نہیں ہے - ہمارے یہاں ریاست مذہبی اور دنیوی طاقت کا مجموعی مجسمہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک وحدت ہے، جس میں اس طرح کی کوئی تقسیم ممکن ہی نہیں - یہ ضروری نہیں کہ خلیفۃ المسلمین اسلام کا افضل ترین پیشوا سمجھا جائے -" وہ اپنے لیکچر "الاجتہاد فی الاسلام میں فرماتے ہیں :

"دراصل اسلام نے روحانی اور مادی (دینی اور دنیوی) دو دو الگ الگ عالم قائم نہیں کیے - وہ ہر عمل کی ماہیت کا فیصلہ، قطع نظر اس کے کہ اس کا تعلق حیات دنیوی سے کہاں تک ہے - زیادہ کم صاحب عمل کی ذہنی روش کو دیکھتے ہوئے کرتا ہے - کیونکہ یہی ہمارے اعمال کا وہ غیر مرئی پس منظر ہے جس سے بالآخر ان کی نوعیت متعین ہوتی ہے - وہ عمل دنیوی ہے جس میں ہم زندگی کی اس لامتناہی کثرت کو جو ہر عمل کے پیچھے واقع ہے، نظرانداز کر دیتے ہیں، اور وہ روحانی ہے جس میں اس ساری کثرت کا لحاظ رکھ لیا جائے - گویا

یہ ایک ہی حقیقت ہے جو ازروئے اسلام ایک پہلو سے تو کلیسا ، لیکن دوسرے پہلو سے ریاست کی شکل اختیار کر لیتی ہے ، اور اس لیے یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ریاست اور کلیسا ایک ہی چیز کے دو اجزا ہیں ۔ دراصل اسلام ایک واحد اور ناقابل تجزیہ حقیقت ہے اور آپ جیسے جیسے اپنا نقطۂ نظر بدل کر دیکھتے ہیں ، وہ ریاست سے کلیسا کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔''

لوتھر نے مذہب کو سیاست سے علیحدہ کیا ، اقبال اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں :

''سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا تھا ۔ رفتہ رفتہ اس سے کلیسا کی ایک وسیع حکومت قائم ہوگئی ۔ لوتھر کا احتجاج دراصل اسی کلیسائی حکومت کے خلاف تھا ۔ اس کو دنیاوی نظام سیاست سے کوئی بحث نہ تھی ، کیونکہ اس قسم کا نظام مسیحیت میں موجود نہ تھا ۔ غور سے دیکھا جائے تو لوتھر کی بغاوت ہر طرح حق بجانب تھی ۔ اگرچہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا ، جس کے مخصوص حالات کے ماتحت اس تحریک کا آغاز ہوا ۔ لطف یہ ہے کہ آج بھی یورپین سلطنتیں ہیں جو مسیحیت کے اخلاق اور مذہبی عقائد کی پامالی کے بعد ایک متحدہ یورپ کا خواب دیکھ رہی ہیں ۔ باالفاظ دیگر ان کو ایسے اتحاد کی ضرورت کا احساس ہو چلا ہے جو کلیسا کے ماتحت انہیں حاصل تو تھا لیکن جس کو اخوت انسانی کے اس عالمگیر روشنی میں تعمیر کرنے کی بجائے جو مسیح کے دل میں موجود تھا ۔ انھوں نے لوتھر کے زیر اثر تباہ و برباد کردیا ۔''

لیکن چونکہ میکاولی نے سیاست کو مذہب سے جدا کیا ، اس لیے اقبال نے اس پر سخت تنقید کی ۔ اسے شیطان کا رسول قرار دیا :

آں فلار نساوی باطل پرست
سرمۂ او دیدۂ مردم شکست

نسخۂ بہر شہنشاہان نوشت
در گلِ ما دانۂ پیکار کشت
فطرت او سوئے ظلمت بردہ رفت
حق ز تیغِ خامۂ او لخت لخت
بت گری مانندِ آذر پیشہ اش
بست نقش تازۂ اندیش اش
مملکت را دین او معبود ساخت
فکر او مذموم را محمود ساخت

غرض ہم دیکھتے کہ اقبال زندگی کو ایک اکائی خیال کرتے ہیں ، جسے مختلف شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ۔ بناہریں وہ مملکت کی بنیادیں مذہب اور سیاست پر اس طرح استوار کرتے ہیں کہ وہ وسیع تر مفہوم میں ایک آصول بن جاتے ہیں اور یہ آصول مذہب اور اخلاق ہے ۔

اس مملکت میں تمام قوت کا ماخذ اور منبع خدا ہے ، وہ اقتدارِ اعلیٰ ہے ، مملکت کا اصل حاکم وہی ہے ، بادشاہت صرف اسی کے لیے ہے ۔ خلیفہ کی حیثیت صرف ایک نائب کی ہے ، جو قوانین خداوندی کا پابند ہے ۔ مملکت کا اصل مالک خدا اور صرف خدا ہے ۔ مملکت کے قیام کا مقصد اس دنیا میں خدا کی حکومت قائم کرنا ہے :

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونی سرش افگندہ نیست

خدا حکمران اعلیٰ ہے اور بندہ کا کام اس کی اطاعت ہے ، خدا کی اطاعت اس کی اپنی معیاری فطرت کی اطاعت ہے ، اور اصل آزادی اسی میں مضمر ہے : ''اسلام بحیثیت ایک نظامِ سیاست کے اصول توحید کو انسانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا ایک

عملی طریقہ ہے۔ اس کا مطالبہ وفا داری خدا کے لیے نہ کہ تخت و تاج کے لیے ، اور چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ تمام زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے ، اس لیے اس کی اطاعت شعاری کا درحقیقت مطلب یہ ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت کی اطاعت شعاری اختیار کرتا ہے۔"

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال ایک مذہبی ریاست کے قائل ہیں۔ وہ اس قسم کی ریاست کے قائل نہیں ، جس کے زمامِ اقتدار کسی ایسے خلیفتہ اللہ فی الارض کے ہاتھ میں ہو ، جو اپنی مفروضہ معصومیت کے غدر میں اپنے جور و استبداد پر ہمیشہ ایک پردہ سا ڈال رکھے ، ہاں وہ اس قسم کی ریاست کے ضرور قائل ہیں ، بلکہ متمنی ہیں ، جس میں مساوات ، حریت اور حفظِ نوعِ انسانی بحیثیت اساسِ توحید کے زمان و مکان کی دنیا میں ایک زبردست قوت بن کر ظاہر ہوں اور یہ اصول ایک مخصوص جمعیتِ انسانی میں جاری و ساری ہوں۔

اس مملکت کا آئین قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم جامع اور مانع کتاب ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام بنیادی اصول موجود ہیں اور کوئی ایسا بنیادی اصول نہیں ، جو اس میں موجود نہ ہو ، جو اس سے باہر ہو۔ یہ تمام اصول وحی کے ذریعہ رسول اقدس پر نازل ہوئے :

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست ؟
زیرِ گردوں سر تمکین تو چیست ؟
آن کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

ہستیٔ مسلم ز آئین است و بس
باطن دینِ نبی این است و بس

از یک آئینی مسلمان زنده است
پیکرِ ملت ز قرآن زنده است

جہاں تک ان بنیادی اصولوں کی تشریح اور ماحول اور حالات کے مطابق ان کے نفاذ کا تعلق ہے وہ یقیناً قانون دان اصحاب کا کام ہے ۔ اقبال اس سلسلے میں رقمطراز ہیں :

''ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ قانونِ اسلامی کے مختلف اصول وحی کے ذریعہ نازل ہوئے ۔ لیکن اس کی تفصیل قانون دان اصحاب کے لیے چھوڑ دی گئی ہے ، تاکہ وہ ہر دنیوی معاملہ پر حاوی آ سکے ۔ اس واسطے یہ کہنا کہ اسلامی قانون کے تمام نظم و نسق کا مالک جج ہوتا ہے اور اسلامی دستور میں قانون دان قانون سازی کا کام کرتا ہے ، بہت حد تک صحیح ہے ۔ لیکن اگر کوئی ایسا نیا معاملہ پیش آ جائے ، جس کے متعلق اسلام میں کوئی قانون موجود نہ ہو ، تو پھر تمام ملت اسلامیہ کی رائے قانون کا ماخذ بن جاتی ہے ، لیکن مجھے اس کا علم نہیں کہ آیا کبھی تمام مسلم قوم اس مقصد کے لیے ایک جگہ جمع ہوئی ہے ؟''

یہ مملکت افراد اختلاط سے پیدا ہوتی ہے ، اس میں تمام قوت کا ماخذ خدا ہے اور اس مملکت کا آئین قرآنِ کریم ہے ، لیکن اس مملکت کی ترقی کا دار و مدار ، اور اس کے افراد کی صحیح تربیت کا انحصار نبوت پر ہے ۔ اس ملت کے ارکان اساسی دو ہیں ۔ اول توحید اور دوم رسالت ۔ رسالتِ محمدیہ کا مقصد بنی نوع آدم میں حریت ، مساوات اور اخوت کی تشکیل اور تاسیس ہے ۔ اس کا کمال رسولِ اقدس کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں مضمر ہے ۔ اس ملت کا مرکزِ محسوس بیت الحرام ہے ۔ جمعیت حقیقی کا انحصار ملت کے نصب العین کو اپنانے میں ہے اور امتِ محمدیہ کا نصب العین توحید کی حفاظت اور اس کی تبلیغ ہے ۔ ملت کی توسیع کا دار و مدار قوائے نظامِ عالم کی تسخیر میں ہے ۔ حیاتِ ملت کا کمال یہ ہے کہ ملت بھی فرد کی طرح احساس خودی پیدا کرے ، اور اس احساس

کی تولید اور تکمیل صرف ملت کی روایات کے تحفظ کے ذریعہ ممکن ہے اور تسلسل حیاتِ ملیہ کا استحکام ملت کی مخصوص روایات کی پابندی میں ہے :

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید
وز رسالت در تن ما جاں دمید
حرفِ بے صوتِ اندریں عالم بدیم
از رسالت مصرع موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزار ما یک است
جزو ما از جزو مالاینفک است
آں کہ شان اوست یہدی من یرید
از رسالت حلقہ گرد ما کشید

کل مؤمن اخوة اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ
در نہاد او مساوات آمدہ
ہمچو سرو آزاد فرزندانِ او
پختہ از قالو بلیٰ پیمانِ او
سجدۂ حق کل بسیمائش زدہ
ماہ و انجم بوسہ بر پایش زدہ

قانون کی نظر میں اس مملکت کے تمام باشندے برابر ہیں ۔ اقبال نے اس نقطہ پر اپنے ایک مضمون میں مفصل بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ملت کی بنیادی صفات کیا ہیں اور اس کے ممبر کے لیے کن شرائط کو پورا کرنا ضروری ہے ۔ ان کے لحاظ سے اسلامی ریاست میں قانون کی نظر میں تمام مسلمان برابر ہیں ۔ اس میں کسی مخصوص طبقہ ، مذہبی جماعت یا

ذات پات کی کوئی تمیز نہیں ہے - رسولِ خدا نے اپنے آخری ایام میں فرمایا تھا - اگر میں نے کسی کو ضرب پہنچائی ہو ، تو میری کمر حاضر ہے کہ وہ مجھے ضرب پہنچائے - اگر میں نے کسی کے ساتھ کوئی نازیبا سلوک روا رکھا ہو ، تو بہتر ہے کہ وہ اس کا بدلہ لے لے - اگر میں نے کسی سے کچھ لیا ہے تو میرا تمام مال و متاع اس کے لیے حاضر ہے - ایک شخص اٹھا اور اس نے تین درہم کا دعویٰ کیا - رسولِ خدا نے فرمایا ، میں بہتر سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہونا ہو ، وہ یہاں ہو لے ، بہ نسبت اس کے کہ آخرت میں کچھ ہو - اور وہ رقم آپ نے وہیں ادا کر دی -

قانوناً اسلام نسل کے ظاہری طور پر قدرتی اور قومیت کے اختلافات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے - اسلام کا سیاسی مطمح نظر یہ ہے کہ نسل اور قومیت کے اختلافات کو مٹا کر ایک متحدہ ملت بنائی جائے - اسلام کے لحاظ سے قومیت سیاسی ترقی کا منتہائے نظر نہیں ہے ، کیونکہ قوانین اسلام کے اصول کسی خاص قوم کی مخصوص عادات و اطوار پر نہیں بنائے گئے ہیں بلکہ انسانی فطرت پر اس ملت کا اندرونی اتصال اور اتفاقِ نسل ، قوم یا جغرافیائی حدود کی وجہ سے نہیں ہوگا ، اور نہ ہی زبان اور تمدنی حالات کی یکسانیت پر ، بلکہ مذہبی اور سیاسی مطمح نظر کے ایک ہونے پر سینٹ پال کے الفاظ میں ہم اس چیز کو "یکسانیت قلب" کہتے ہیں - اس لیے اس ملت کا ممبر ہونے کے لیے پیدائش ، شادی ، سکونت یا قومی حقوق نہ کوئی چیز مانع ہو سکتی ہے اور نہ مددگار ، اس کا دار و مدار سب کے سامنے یکسانیت قلب کا اعلان کر دینے میں ہے ، اور جب کوئی شخص کبھی اس یکسانیت قلب سے علیحدہ ہوا ، تو اسی وقت وہ اس ملت سے خارج ہو گیا - اس ملت کو تمام روئے زمین پر حکمران ہونے کا حق ہے - یونانیوں اور رومیوں کی طرح عربوں نے بھی فتوحات کے ذریعہ ایک ایسی زبردست ملت اور عالمگیر ریاست قائم کرنے کی کوشش کی ، لیکن وہ اس مقصدِ اعلیٰ میں کامیاب نہ ہو سکے - لیکن اس خواب کا شرمندۂ تعبیر ہونا ناممکنات میں سے نہیں ، کیونکہ ایسی ملت کا وجود نہ یہ کہ صرف ممکن ہے ، بلکہ چھوٹے پیمانے پر ایسی ملت اب بھی موجود ہے - موجودہ سیاسی قوموں کی زندگی

کا انحصار بہت حد تک ان کے موجودہ آئین ، قوانین اور حکومت پر ہوتا ہے اور ان مختلف ریاستوں کا دائرہ عمل اس قدر وسیع ہوتا جا رہا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ملنے کے قریب ہو گئی ہیں ۔ اس کے علاوہ ایسی ریاست کا جو انفرادی ریاستوں کی حکومت کے متضاد بھی نہیں ہے ، کیونکہ ملی ریاست حیوانی طاقت کی بنیادوں پر تعمیر نہیں کی جائے گی بلکہ ایک مشترکہ مطمح نظر کی روحانی قوت پر ۔

اس مملکت میں ذاتی ملکیت کی اجازت ہو گی ، لیکن بہت ہی محدود پیمانے پر ، اقبال سرمایہ داری کے سخت خلاف ہیں ۔ سرمایہ داری کا بنیادی اصول ذاتی ملکیت کا اصول ہے کہ ایک شخص جس قدر مال و دولت چاہے اپنے قبضے میں رکھ سکتا ہے ۔ نہ صرف مال و دولت بلکہ وہ ذرائع پیداوار کا بھی مالک ہوتا ہے اور اس طرح عملی طور پر پوری قوم سرمایہ دار کے چنگل میں پھنس کر رہ جاتی ہے ۔ اقبال بے اندازہ دولت اور ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت رکھنے کے مخالف ہیں ۔ وہ ذاتی ملکیت کی کچھ حدود مقرر کر دیتے ہیں تا کہ دوسروں کی حق تلفی نہ ہو ، دوسروں کو اس سے نقصان نہ پہنچے ۔ وہ اس بات کے سخت خلاف ہیں کہ دولت سمٹ کر صرف چند ہاتھوں میں رہ جائے ۔ اس لیے وہ دولت کے حصول اور اس کی ملکیت کی ایسی حدود متعین کرتے ہیں کہ ایک فرد زیادہ دولت کا مالک بن ہی نہ سکے ۔ زیادہ دولت سے ان کی اور ہماری مراد کیا ہے ؟ اس چیز کو انھوں نے کم از کم ایک موقع پر نہایت وضح طور پر پیش کر دیا ہے ۔ اگرچہ اس پر انھوں نے نہ تفصیل سے بحث کی ہے اور نہ اس پر زور دیا ۔ بہرحال اس سے انکار ممکن نہیں کہ اقبال ذاتی ملکیت کو بہت ہی محدود رکھنا چاہتے ہیں ۔ روز مرہ کی ضروریات کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ذاتی ملکیت قرار نہیں دی جا سکتی :

جو حرف قل العفو ، میں پوشیدہ ہے اب تک
اس درد میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

ان کے ذہن میں جو نصب العین ہے ، وہ اس شعر سے بالکل واضح

ہو جاتا ہے - بہرحال غالباً حالات کی مجبوری کی وجہ سے وہ اس پر زیادہ زور دینا پسند نہیں کرتے - اس شعر سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال تنسیخِ آیات کے قائل نہیں - اقبال ذاتی ملکیت کے ایک زبردست ستون کو ضرور مسمار کر دینا چاہتے ہیں - یہ ستون ہے سود - ہم جانتے ہیں کہ اگر سود کو ختم کر دیا جائے تو یہ سرمایہ داری پر ایک کاری ضرب ہو گی ، کیونکہ سود سرمایہ داری کا ایک ستون ہے :

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

———

از ربا آخر چہ می زاید ؟ فتن ؟
کس نداند لذتِ قرض حسن
از ربا تیرہ دلی چون خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ

دوسرے ذرائع پیداوار کے سلسلہ میں تو اقبال کے خیالات زیادہ واضح نہیں ، لیکن زمین کی ملکیت کے معاملہ میں تو اس میں کوئی شک نہیں --- کہ اقبال تمام زمین اور زمین میں جو کچھ ہے ، وہ سب خدا کا ہے - کسی شخص کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس قدر زمین کو اپنے قبضہ میں رکھے ، جسے وہ بلاواسطہ اپنے کام میں نہ لا سکے - خدا تمام زمین کا مالک ہے - اس لیے عملی طور پر وہ اس شخص کا حصہ ہے ، جو اسے کام میں لا سکے - عملی طور پر کسان اور کاشتکار اس کا مالک ہے ، خلیفہ پیداوار کا کچھ حصہ کسان اور کاشتکار سے بیت المال (خزانہ) کے لیے ضرور لے سکتا ہے ، لیکن خلیفہ اور کاشتکار کے درمیان کسی اور واسطہ یا وسیلہ کی موجودگی بالکل غلط اور ظالمانہ ہے - اقبال نے بار بار اس چیز کو واضح کیا ہے کہ زمین خدا کی ہے ، صرف خدا کی :

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

———

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ٘ گندم کو جلا دو

الارض للہ ، بالِ جبریل میں فرماتے ہیں :

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب !
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے ؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہ٘ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب
دہ خدایا ! یہ زمین تیری نہیں ، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں ، تیری نہیں ، میری نہیں

جاوید نامہ میں ارض ملک خداست ، تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے :

حق زمین را جز متاعِ ما نہ گفت
این متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا ! نکتہ٘ از من پذیر
رزق و گور ازوے بگیر اورامگیر
تو عقابی طائف افلاک شو
بال و پر بکشا و پاک از خاک شو
باطن الارض للہ ظاہر است
ہر کہ این ظاہر نہ بیند کافر است

پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ۲۲ فروری ۱۹۲۸ء کو انکم ٹیکس کے اصولوں کو محاصلِ اراضی پر عائد کرنے کی تجویز پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے سب سے پہلے اس بات کی شدید مخالفت کی کہ زمین حکومت کی ملکیت ہوتی ہے - آپ کے خیال میں اس ملکیت عامہ کا دعویٰ نہ عہد قدیم میں کسی نے کیا اور نہ سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں ایسا مطالبہ کیا

گیا ، اور اگر کسی وقت کسی ملک کے اندر یہ نظریہ رائج بھی تھا تو اس بیسویں صدی میں اسے جائز نہیں مانا جا سکتا۔ اس نظریہ پر سب سے پہلے جس یورپین مصنف نے تبصرہ کیا ، وہ بیڈن تھا۔ ۱۸۹۲ء میں اس نے پوری تحقیق و تفتیش کے بعد اس نظریہ کو بالکل مسترد کر دیا۔ ۱۹۰۳ء میں بریگز نے ہندوستان کے اندر ملکیت کے قانون اور رواج کی پوری تحقیقات کی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ تاریخ ہند کے کسی دور میں بھی حکومت زمین کی ملکیت کے مدعی نہیں ہوئی۔ بہرکیف لارڈ کرزن کے عہد میں یہ نظریہ پیش کیا گیا لیکن ٹیکس کمیٹی کی رپورٹ نے ، جو کچھ عرصہ پیشتر چھپ چکی تھی ، یہ امر واضح طور پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ہے۔ اسی بنا پر اسی تقریر میں آپ نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ زمین کے لگان کے سلسلے میں بھی انکم ٹیکس کے اصول پر عمل کیا جائے اور صلاحیت و استطاعت کے اصول یا مدارج کے اصول کو اپنایا جائے اور اسی اصول کے مطابق جس شخص کے پاس پانچ بیگھہ سے زیادہ زمین نہ ہو ، اس سے لگان بالکل نہ لیا جائے۔

اقبال ملوکیت ، آمریت اور سرمایہ داری کے سخت خلاف ہیں۔ انھوں نے ان نظامات کے خلاف اس قدر زیادہ اور اس قدر جوش و خروش سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ، کہ اس کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ ان کے لحاظ سے اسلامی ریاست میں ان معاشی اور سیاسی نظامات کے لیے مطلق کوئی جگہ نہیں۔ اسلامی نظام حکومت ان تمام نظامات سے پاک ہے اور اسے ان سے مطلق کوئی واسطہ نہیں ، جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے وہ اس کے بھی موافق نہیں۔ انھوں نے بارہا اس پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے صالح اجزا کے بھی معترف ہیں۔ ''جمہوری طرز حکومت میں طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں ، لیکن انسانی تجربہ اس بات کو ثابت کر دیتا ہے کہ یہ دقتیں ناقابل عبور نہیں۔'' اسلامی نظام مملکت میں جمہوریت کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے اور اس میں خلیفہ کا انتخاب جمہوری طریقہ پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ طریقۂ انتخاب موجودہ دور کے طریقۂ انتخاب سے بہت مختلف ہے ، کیونکہ خلیفہ کا انتخاب عموماً اس کی تمام عمر کے لیے ہوتا ہے ، اور

جب تک کسی خاص وجہ سے اسے معزول نہ کیا جائے۔ وہ آخر وقت تک خلیفہ رہتا ہے، لیکن موجودہ جمہوریت میں سربراہِ مملکت کا انتخاب صرف ایک خاص عرصہ کے لیے ہوتا ہے۔ اور اس عرصہ کے بعد وہ شخص اپنے عہدہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ مدۃ العمر کے انتخاب میں کچھ خوبیاں بھی ہیں اور کچھ خامیاں بھی۔ بہرحال یہ فرق بنیادی ہے اور اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں جمہوریت کے موجودہ دور میں صرف سربراہِ مملکت ہی کا انتخاب نہیں ہوتا۔ بلکہ قانون ساز اسمبلیوں اور بعض دوسرے عہدوں کا بھی انتخاب ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت میں قانون سازی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (بہرحال عملی طور پر قانون داں قانون سازی کا کام کرتے ہیں) لیکن دوسرے عہدوں کے لیے بھی کوئی انتخاب نہیں ہوتا بلکہ خلیفہ تمام اعلیٰ عہدہ داروں کو مقرر کرتا ہے، علاوہ ازیں خلیفہ کے پاس ویٹو کی طاقت ہوتی ہے، لیکن موجودہ دور میں ویٹو کی طاقت عام طور پر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ اکثر فیصلے اکثریت رائے ہی سے ہوتے ہیں۔

یہ بات کہنے میں بھی کچھ زیادہ وزن نہیں کہ اسلامی امیر اس منصب کے لیے اپنے آپ کو پیش نہیں کر سکتا، اور جو شخص ایسا کرے وہ اس منصب کا اہل نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ فطری طور پر تو موجودہ جمہوریتوں میں بھی کوئی شخص کسی انتخاب کے لیے اپنا نام پیش نہیں کر سکتا۔ دوسرے اشخاص اس کا نام پیش کرتے ہیں، اور وہ تحریری طور پر صرف یہ چیز پیش کرتا ہے کہ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

اقبال اشتراکیت کے بھی مداح ہیں۔ وہ اشتراکیت کے ان اصولوں کو قبول کر لیتے ہیں، جو ان کے لحاظ سے اسلام کے مطابق ہیں۔ وہ جس نظامِ حکومت کے متمنی ہیں اس میں ان اصولوں کو شامل کرنا چاہتے ہیں، اس وجہ سے نہیں کہ وہ اشتراکی اصول ہیں بلکہ اس بنا پر کہ وہ اسلام کے مطابق ہیں اور ان کے بغیر خلافت کا استحکام ممکن نہیں۔

اس مملکت کا اصل مالک خدا ہے، لیکن سیاسی حکومت کی کفیل

اور امین پوری ملت اسلامیہ ہے ۔ کوئی ایک خاص طبقہ ، فرقہ ، جماعت ، گروہ اس حکومت کا امین قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ پوری ملت اسلامیہ آزاد اور عمل انتخاب سے ایک شخص کو خلیفہ منتخب کر کے سیاسی حکومت کو اس شخص میں ودیعت کر دیتی ہے ۔ انتخاب کے بعد وہ ملت اسلامیہ کا ایک ایسا نمائندہ ہو جاتا ہے ، جس میں تمام ملک کی رائے عامہ مرکوز ہو جاتی ہے اور تمام قوم کا دل اس کے سینے میں دھڑکتا ہے ۔ وہ مسند حکومت پر متمکن ہوتا ہے ۔ لیکن اس کا یہ عہدہ اسے کسی برتری یا ترجیح کا مستحق نہیں بناتا ۔ نظری طور پر وہ تمام دوسرے مسلمانوں کے برابر ہوتا ہے ۔ اسے قانون کا اسی طرح پابند ہونا ہوتا ہے جس طرح تمام دوسرے مسلمانوں کو ، خلیفہ معاملات حکومت کو چلانے کا خود ذمہ دار ہوتا ہے ۔ لیکن چونکہ اسلام میں صلاح مشورہ کو بہت اہم اور ضروری قرار دیا گیا ہے اس لیے خلیفہ کے واسطے معاملات خلافت میں مجلس شوریٰ سے مشورہ لینا ضروری اور بہت ضروری ہے ۔ اگرچہ اسے ماننا ضروری نہیں ۔ وہ اکثریت کی رائے کو قبول کرسکتا ہے اور اقلیت کی رائے کو بھی اور دونوں کی رائے کو مسترد کر کے اپنی ذمہ داری پر عمل پیرا ہو سکتا ہے ۔ خلیفہ کے انتخاب کا اسلام میں کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں ۔ ہاں ایک چیز بہت واضح اور صاف ہے اور وہ یہ کہ اسلام میں خاندانی اور موروثی بادشاہت کے لیے کوئی جگہ نہیں ، بادشاہت کے تخیل تک سے عرب ناواقف تھے ۔ اگرچہ بعد میں مسلمانوں میں خاندانی بادشاہت کا رواج عام ہوگیا تھا بہرحال اسے اسلام اور اسلامی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں اسلام میں جس چیز پر زور دیا گیا ہے ، وہ اصول انتخاب ہے ۔ رہا یہ امر کہ عملاً حکومت کے اس طرز عمل کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے اس اصول کی کیا کیا تشریح و تاویل کی جا سکتی ہے اور اس سے کون کون سی فروعات و تفصیلات مستنبط ہوتی ہیں ، اس بات کے فیصلے کا دار و مدار وقتی حالات اور دیگر واقعات پر چھوڑ دیا گیا ہے ، جو مختلف زمانوں میں مختلف ممالک میں پیدا ہو سکتے ہیں ، مگر شومئی قسمت سے مسلمانوں میں انتخاب کے مسئلے کو فروغ دینے کی سعی سے وہ قاصر رہے ۔

اقبال الماوردی کے اس نظریے سے متفق ہیں کہ خلیفہ میں کچھ صفات ہونی چاہئیں اور صرف اس صورت میں وہ خلیفہ منتخب ہو سکتا ہے۔ امیدوار خلافت میں مندرجہ ذیل صفات ہونی چاہئیں :

(۱) سیرت ، اخلاق حسنہ سے آزاستہ ہو ، عادات و خصائل مخیر مشبہ ہوں ۔

(۲) جسمانی اور دماغی طور پر ہر خامی سے برأت ۔

(۳) مذہب اور شریعت کا ضروری علم حاصل ہو ، تا کہ وہ اختلافیہ مسائل کو طے کر سکے ۔ نظری طور پر یہ چیز صحیح ہے ، لیکن عملی طور پر خلیفہ کی طاقت کم از کم زمانہ مابعد میں تقسیم کر دی گئی تھی ۔

(۴) بصیرت ، جو حاکم کے لیے ضروری ہے ۔

(۵) ہمت و طاقت ، تا کہ حکومت کی حفاظت کر سکے ۔

(۶) خاندانِ قریش میں سے ہو ۔ موجودہ اہلسنت الجماعت قانون دان اس شرط کو لازمی نہیں سمجھتے ، کیونکہ رسولِ خدا نے کبھی کسی شخص کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا ۔

(۷) بالغ ہو (الغزالی) ۔

(۸) مرد ہو (البغدادی) خوارج اس شرط کو نہیں مانتے ۔ ان کے خیال میں ایک عورت بھی خلیفہ بن سکتی ہے ۔ جس طرح خلیفہ میں کچھ صفات کا ہونا ضروری ہے ، اسی طرح رائے دہندگان میں بھی چند صفات کا وجود ہونا ضروری ہے ، اس ضمن میں اقبال الماوردی سے متفق ہیں ۔

(۱) نیک نامی ۔

(۲) معاملاتِ حکومت سے کچھ واقفیت رکھنا ۔

(۳) قوتِ فیصلہ اور بصیرت باطنی سے مزین ہونا ۔

اسلام میں خلیفہ کا انتخاب مدۃ العمر کے لیے ہوتا ہے نہ کہ صرف ایک خاص مدت کے لیے ۔ لیکن قوم کو خلیفہ کو معزول کرنے کا حق

اور اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اگر خلیفہ احکامات شریعت کے مطابق حکومت نہیں کرتا، یا جسمانی یا دماغی طور پر حکومت کے قابل نہیں رہتا، تو وہ خلافت کا حق دار نہیں رہتا اور رائے دہندگان کو اس بات کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ خلیفہ یا اس کے عاملین کی برطرفی کا مطالبہ کر سکیں۔

اقبال کے لحاظ سے ایک ہی زمانے میں دو یا دو سے زیادہ خلفاء اور خلافتوں کے ہونے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ یہ خلافتیں مختلف ممالک میں ہوں۔ اس مسئلہ پر مسلم قانون دانوں نے بہت بحث کی ہے۔ ابن جامعہ کا خیال ہے کہ صرف ایک خلافت ممکن ہے۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ ایک ہی وقت میں دو یا دو سے زیادہ خلافتوں کے ہونے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ وہ مختلف ممالک میں ہوں۔ ابن خلدون کا نظریہ یقیناً عربوں کے پرانے نظریہ کے خلاف ہے، لیکن چونکہ اسلامی ریاست ایک غیر شخصی طاقت یعنی قانون خداوندی کے ماتحت ہوتی ہے، اس لیے ڈاکٹر اقبال کے لحاظ سے دوسرا نظریہ ٹھیک ہے۔ علاوہ ازیں واقعات اس کے شاہد ہیں کہ اسلام میں دو مقابل خلافتیں عرصہ تک قائم رہی ہیں۔

یہاں ہم نے نظام مملکت کے متعلق ڈاکٹر اقبال کے نظریات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ بہرحال ان بنیادوں اور اساسی اصولوں پر ایک تفصیلی نقشہ بھی بنایا جا سکتا ہے اور اگر عملی طور پر اس نقشہ میں رنگ بھی بھرا جا سکے تو شاید دنیا دوبارہ ایک ایسے نظام مملکت سے روشناس ہو سکے جس میں نوع انسان کی فلاح و بہبود مضمر ہو۔[1]

---

۱ - سر آب، کوئٹہ، اگست ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۹ تا ۱۲۱۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین

اقبال کے قارئین

لکھنے اور پڑھنے والوں کے درمیان جو رشتہ ہوتا ہے اُس کی نوعیت بسا اوقات گہری ، دور رس اور معنی خیز ہوتی ہے ۔ دونوں ایک دوسرے سے متعین ہوتے ہیں ۔ اسی رشتے سے ہر دو فریق کی ذہنی سطح ، میلانات اور مطالبات دریافت کیے جا سکتے ہیں ۔ دونوں ایک دوسرے سے زندہ رہتے ہیں بلکہ کبھی کبھی قاری ہی لکھنے والے کو زندہ رکھتا ہے ۔

یہ رشتے زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں ۔ لکھنے والا ، پڑھنے والے کے لیے کبھی اہم اور ناگزیر ہو جاتا ہے اور کبھی غیر اہم اور شعر و ادب کی محض ایک تاریخ بن کر رہ جاتا ہے ۔ اسی لحاظ سے شاعر و ادیب کی تخلیقات کی معنویت اور اہمیت بدلتی رہتی ہے ۔ وہ کبھی پھیلتی کبھی سمٹتی ، کبھی گہری ، کبھی اتھلی ہوتی رہتی ہے ۔ اس معنویت کو ان مختلف مراحل سے گزرنے میں ایک طاقت ور عنصر عصری تقاضوں کا ہوتا ہے ۔ غرض لکھنے اور پڑھنے والوں کے یہ روابط قرب و بعد ، شکوہ و شکایت ، لطف و انبساط ، ہجر و وصال کے کئی مختلف کیفیات میں بدلتے رہتے ہیں ۔

ہمارے یہاں شعراء میں میاں نظیر اکبرآبادی کو دیکھ لیجیے ، کل کا بازاری شاعر آج کا عوامی شاعر بن گیا ۔ غالب "جنون کی حکایت خونچکاں لکھتے رہے'' اور آج یہ حکایت ''اعلان امر حق'' کی تاریخی راز بن گئی ۔

شاعر اور قاری کا رشتہ اُس وقت اور بھی اہمیت اور نزاکت اختیار کر لیتا ہے جب کوئی شاعر کسی مخصوص فکر ، نظریے ، پیغام یا مشن

کو لے کر ہمارے سامنے آتا ہے ۔ ایسی شاعری قاری کے لیے ایک مسئلہ ، مرحلہ اور سوال و جواب کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے ۔ (آپ نے کبھی غور کیا کہ اقبال کی کتنی نظمیں ہیں جن میں سوال و جواب کا سلسلہ پایا جاتا ہے) ایسی شاعری ایک مسئلہ کیوں کر بن جاتی ہے ، اس کا احساس خود اقبال کو بھی تھا :

اثر کرے نہ کرے سن تو لیے میری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندہ آزاد

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

از حدیثِ دلبری خواہد ز من
آب و رنگِ شاعری خواہد ز من

یہ اشعار قاری کو اقبال سے بدگمان نہیں کرتے بلکہ اس کی فکری اور اسلوبی نوعیت کی طرف "متوجہ" کرتے ہیں ۔ یہ متوجہ کرنا ہی ایک مسئلہ اور مرحلہ ہے ۔ اقبال کی شاعری جن مراحل کو طے اور جن مسائل سے بحث کررہی ہے اس کا احساس خود ان کو ہے ۔ وہ یہ نہیں کہتے ہیں کہ میں شاعر نہیں ہوں ۔ وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ :

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے

اقبال کے فکری عناصر ایک مخصوص پیام اور عشق سے مرتب اور متعین ہوتے ہیں ۔ مگر جو سب سے اہم بات ہے ، وہ یہ ہے کہ ان کا بیشتر پیغام اور مشن شعری تحریک ہی کی وساطت سے ہم تک پہنچتا ہے ۔ اگر شعری تحریک نہ ہوتی "مرغِ چمن" اقبال کو "نغموں پر نہ

آکساتا'' تو پھر اُن کے مجموعہ ہائے کلام طاق پر دھرے رہ جاتے۔
بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ نظریاتی یا فکری شاعری قاری کے لیے ایک امتحان بن جاتی ہے۔ پڑھنے والے کا اختلاف مزاج، اختلاف فکر اور اختلافِ نظر کہاں تک ایسی شاعری کو انگیز کر پاتی ہے، یہ مسئلہ انتہائی غور طلب ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیں کئی اور امور پر توجہ کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً مقصدیت اور شعریت میں کتنا فاصلہ، کتنی قربت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں یا ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں۔ یہ تمام سوالات اقبال کے قاری کا امتحان لیتے رہتے ہیں۔

ان امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جب اقبال کا قاری اُن کا کلام پڑھتا ہے تو آہستہ رفتہ یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ کلام حقیقت شناسی اور ''ذوقِ نظر'' دونوں سے بیک وقت کام لیتا ہے۔ اسی لیے اقبال کے بیشتر قارئین اس سخت مقام سے بہ آسانی گزر جاتے ہیں۔

اصل میں سوال مقصدیت اور شعریت میں تصادم کا نہیں ہے۔ اس کا تعلق معنویت اور شعریت کے باہمی ارتباط سے ہے۔ دونوں میں اگر ہم آہنگی اور ہم رشتگی ہے تو فکری یا نظریاتی کلام بھی بار خاطر نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی یہ دنیا کی بڑی شاعری میں جگہ پاتا ہے۔

یہی ''ہم رشتگی'' اقبال کی فکر کو ''شاعری'' بناتی ہے اور شاعری کو فکری لہجہ دیتی ہے۔

اقبال کی شاعری مسلم ہندی کی تلاش میں ہے نہ مردِ مومن کی جستجو میں ہے۔ اس میں مشرق و مغرب کی آمیزش اور آویزش اور مختلف مکاتبِ فکر کی آواز سنائی دینے کے باوجود مجموعی طور پر ایک منفرد آواز سنائی دیتی ہے جو اقبال کی اپنی فکر و نظر سے بنتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کی شاعری میں مسلم ہندی، مردِ مومن، عشق و خرد، مشرق و مغرب سب کچھ موجود ہے، مگر یہ ان سے آگے کی چیز ہے۔ یہ ''معنی کائنات'' کی تلاش میں طویل سفر پر نکلی ہے۔ جس میں تاریخ، تمدن، مذہب، سائنس اور دیگر علوم و فنون کی منزلیں طے کر لینے کے باوجود ''صدا کن فیکون'' دما دم آ رہی ہے، اور کائنات اپنی معنویت

کے ساتھ ''ہر لحظہ متغیر'' ہوتی رہتی ہے - یہ سفر ہی زندگی کی معنویت رکھتا ہے :

عالمِ آب و خاک و باد ، سر عیاں ہے ، تو کہ میں
وہ جو نظر سے ہے نہاں ، اُس کا جہاں ہے تو کہ میں

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

اقبال کے یہاں 'آدمی' کا یہ سفر ہی سب کچھ ہے - آدمی سراپا جستجو ہے - اسی آدمی کی جستجو اقبال کے کلام کو سوز و ساز کی شعریت اور ''لذتِ طلب'' بخشی رہتی ہے -

اقبال کا قاری جب اُن کے ساتھ اس طویل سفر پر نکلتا ہے تو اُن کے ''نظریاتی مقامات'' اور فکری اختلافات پیچھے چھوٹ جاتے ہیں اور وہ آگے بڑھ جاتا ہے -

اگر ہم ان امور کو مدِ نظر رکھیں تو ہمیں یہ سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آنی چاہیے کہ اقبال کے پڑھنے اور ان کو پسند کرنے والے کیوں قیدِ ملت اور قیدِ وطن دونوں سے آزاد ہیں - اُن کی شاعری کو مشرق و مغرب کی پکار اور احیائے اسلام کی تدابیر کے آئینے میں دیکھنا ہی کافی نہیں ہے ، اُسے حیات و کائنات کے بڑے پس منظر میں رکھ کر دیکھنا اور سمجھنا زیادہ مستحسن ہے -

چنانچہ اقبال کے قارئین کے ہجوم میں قاری کی پہلی قسم وہ سامنے آتی ہے جو اُن کی شاعری کی ''زمین کو بے حدود'' اور اُس کے ''آفاق کو نے ثغور'' سمجھتی ہے - اس قاری کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک خصوصی ذہنی سطح اور تربیت یافتہ دماغ رکھتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ تعداد میں بہت کم ہے - اس قلتِ تعداد کے باوجود اسے نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے - پھر بھی ہم یہاں ذرا دوسری نوعیت

کے قارئین کی تلاش میں ہیں جن سے ان کے کلام کے مختلف پہلو سامنے آ سکیں۔

اقبال کی شاعری پہلو دار ہے جو اپنی دل آویزی میں خصوصی اور عمومی دونوں کیفیتیں رکھتی ہے۔ اس کی پرسوز نغمگی دل اور ذہن دونوں کو چھوتی ہے۔ اس کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہے۔ ''رند و فقیہہ و میر و پیر'' سب اس کے اسیر ہیں۔ اس میں ملک سے محبت بھی ہے۔ بین الاقوامی وسیع النظری بھی مناظر قدرت بھی ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کے نکات بھی ملتے ہیں۔ تنہائی کا سوز اور کائناتی تحیر بھی موجود ہے۔ اہرمن و یزدان سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ حسن و عشق کی جانشینی بھی ہے۔ تاریخی شعور کی کارفرمائی بھی ہے — یہ زمانی اور غیر زمانی، مکانی اور غیر مکانی سب کچھ ہے۔

اقبال کے قارئین کی تقسیم بھی انھیں نسبتوں سے کی جا سکتی ہے۔ اُن کے قارئین کی اپنی نظر اور اُن کا اپنا ذوق اس ''خوانِ یغما'' سے اپنی پسند کی چیزیں منتخب کر سکتا ہے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہر قسم کے قارئین کو دعوت فکر و نظر دیتی ہے۔ اس شاعری کی دکان بھی اونچی ہے اور پکوان بھی پھیکا نہیں ہے۔ یہ اپنی سنجیدہ سطح سے نیچے اُتر کر بات نہیں کرتی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آدمیت احترام آدمی، اس کا ایمان ہے۔ قاری کو اقبال مایوس نہیں کرتے، خواہ وہ کسی قسم کا ہو۔

اقبال کی شاعری کے اس وصف سے ہمیں دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ یہ کوئی بڑی سادہ، سہل اور عوامی قسم کی شاعری ہے۔ اس کے برعکس اپنی حکیمانہ فکر اور فارسی آمیز اندازِ بیان کی بنا پر یہ اچھی خاصی مشکل شاعری ہے۔ پھر یہ کیوں غیر محدود طور پر دلپذیر ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ ''حدیثِ دلبری'' سے اعلانِ برئیت کے باوجود یہ یکسر ''حدیثِ دلبری'' ہے:

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

عروس لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب

پوری شاعری ہجر کی ایک پر سوز آواز ہے نالہ نیم شبی اور گریہ سحری سے اس کی آبیاری ہوتی ہے ۔ دوسری بات اس کی باطنی نغمگی ہے ۔ معنی نغمہ بار ہیں اور الفاظ ساز بدوش ۔ اس کی نغمگی مشکل مقامات کو سہل کرتی جاتی ہے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ عصر حاضر کے تاریخی شعور اور اجتماعی جذبے کو اس نے زبان دے دی ہے اور آخری بات جو ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ اقبال کی آواز اردو شاعری میں کوئی اجنبی آواز نہیں ہے ۔ یہ اردو شاعری کے توانا روایت اور اردو شعرا کے رمز آشنا اسالیب کی تربیت یافتہ ہے ۔ داغ اُن کے استاد تھے اُسے کبھی بھلانا نہیں چاہیے ۔ حافظ ، عرفی ، بیدل ، انیس اور حالی سب کی رفاقت انہیں میسر تھی ۔ اسی کی جاذبیت ، اس کے اجنبی ہونے میں نہیں ہے بلکہ یار آشنا ہونے میں ہے جس سے خلوت و جلوت میں بے محابہ گفتگو کی جا سکتی ہے ۔ اس صدی میں ہماری تہذیبی زندگی کا یہ بہت تقویت بخش اظہار ہے ۔

اقبال کی شاعری کے ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قارئین کی تقسیم شاید ممکن نہیں ۔ لیکن چند نمایاں قسم کے قارئین سے پھر بھی بحث کی جا سکتی ہے کوئی حتمی جو اپنے ذوق شعری کے لحاظ سے اقبال کو پڑھتے اور پسند کرتے ہیں ۔

البتہ ان کی پسند کل و جزو کے اعتبار سے متعین ہوتی ہے ۔ بعض بانگ درا ہی کو حاصل شاعری سمجھتے ہیں ۔ کچھ بانگ درا اور بال جبریل دونوں کو تسکین ذوق کا باعث پاتے ہیں مگر اس سے آگے نہیں بڑھتے ۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کو پسند کرتے ہیں ۔ یہی بات اقبال کے فارسی کلام پر بھی صادق آتی ہے ۔

اس نوع کے قاری اقبال کے یہاں جس ''شے'' کو شدت سے تلاش کرتے ہیں وہ ہے شاعری یا شعریت ۔ یہ بری بات نہیں بلکہ بڑی بات ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پڑھنے والا زندہ ہے اور اقبال کے کلام کو ابھی تک زندہ سمجھتا ہے۔ وہ نہ خود بد ذوق ہے اور نہ اقبال کو بدذوق سمجھتا ہے ورنہ اقبال کو صرف ''حکیم'' قرار دے کر ان کو پڑھنا حکمت سے بے خبری اور شاعری سے بدظنی ہے ۔ ''حکمت'' سے بے خبری تو خیر زندگی کو کچھ دے بھی جاتی ہے — کچھ معصومیت ، کچھ طہارت کچھ تازگی، یہاں تک کہ کچھ ''سمجھ بوجھ'' بھی ۔ مگر شاعری سے بدظنی جوش صاحب کے الفاظ میں ''الحفیظ والامان'' — آدمی سے حسن بینی اور حسن آفرینی دونوں چھین لیتی ہے ۔ اقبال کے سخن شناس قارئین نے خدا کا شکر ہے ، اقبال کے ساتھ یہ بد سلوکی نہیں کی ہے ۔ انہوں نے اقبال کی شاعری کا اقرار کرکے اقبال کا اعتبار قائم رکھا ہے ۔ کسی شاعر کا میر و غالب کی صف میں پہنچ جانا ایک اعزاز ہے ۔

اس کے بعد ان قارئین کی باری آتی ہے جو اقبال کو نظریاتی لحاظ سے پڑھتے ہیں۔ ان میں کچھ سیاسی کچھ مذہبی نظریات اور عقائد کے حامل ہیں ۔ ان کے بارے میں زیادہ کہنے سننے کی گنجائش کم ہے :

کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

یہ دونوں ہی اقبال کے بڑے ''نحوس'' پڑھنے والے ہیں ۔ اس میں کیا شک ہے کہ اقبال کے یہاں سیاست بھی ہے اور دین بھی اور یہ ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں ۔ حالانکہ اس ''کاچر'' کے باوجود تھوڑی بہت چنگیزیت کی رمق باقی رہ جاتی ہے ۔

اقبال کو اسی نظر سے پڑھنے والے اقبال کے کلام کے دوسرے

اوصاف کی طرف مشکل ہی سے توجہ کرتے ہیں۔ وہ نظریاتی مطالعے سے آگے نہیں بڑھتے۔ سیاسی نظریات کے تحت اُن کو پڑھنے والا کچھ پاتا ضرور ہے مگر کھوتا زیادہ ہے۔ خالص دینی نقطہٗ نظر سے اقبال کے پڑھنے والے کو بھی ممکن ہے اقبال پوری طرح مطمئن نہ کرسکیں اور کچھ اختلافی مسائل اٹھ کھڑے ہوں۔

بات کچھ یوں ہے کہ اقبال کا کلام آدمیوں کو مسلمان بنانے کے لیے نہیں۔ conversion poetry تبدیلی مذہب میں کام آنے والی شاعری نہیں ہے۔ مرد مومن کی اصطلاح سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے یہی لکھا ہے کہ جس شخص میں یہ اوصاف پائے جائیں وہی مرد مومن ہے:

قہر تو یہ ہے کہ کافر تو ملیں حور و قصور

بہر حال اس قاری کا وجود بسا غنیمت ہے۔ اس سے سیاست، دین اور حکمت کے کچھ نکات تو سامنے آ جاتے ہیں:

بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

یہاں تک تو اقبال کے اُن قارئین سے بحث تھی جو اقبال کے کلام کو مختلف زاویوں سے پڑھتے ہیں۔ اب اقبال کے اُس قاری پر بھی نظر ڈالیں جو اُن کی شاعری کا اصل مخاطب ہے۔ یہ نوجوان ہے۔ اقبال کے خوابوں کی تعبیر، ان کی امیدوں کا مرکز۔ اس قاری کی تلاش اُن کے پورے کلام میں ہے۔ اس سے گفتگو کرنے کی شدید خواہش اُن کے یہاں پائی جاتی ہے:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے — (بانگِ درا)
جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر — (بالِ جبریل)

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں — (ضربِ کلیم)
ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا — (ارمغانِ حجاز)

اپنے فارسی کلام میں اقبال نے کھل کر نئی اور پرانی نسل سے بحث کی ہے اور ساری امیدیں نسلِ نو سے وابستہ کر دی ہیں:

نا اُمید استم ز یارانِ قدیم
طورِ من سوزد کہ مے آید کلیم 'اسرار و رموز'

پیامِ مشرق میں گوئٹے اور اپنا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

او ز افرنگی جوانان مثلِ برق
شعلۂ من از دمِ پیرانِ شرق

بالِ جبریل میں ایک جگہ کس درد سے کہتے ہیں :

کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات
کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات

اقبال ایک نئی دنیا ، نئی زندگی کی جستجو میں ہے اور یہ نوجوانوں ہی سے تشکیل پا سکتی ہے - انھوں نے اپنی زندگی ہی میں نوجوانوں کے اُس قافلے کو پا لیا تھا جو اُن کے کلام کو سینے سے لگائے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا مگر دوسری جنگِ عظیم اور تیسری ایٹمی جنگ کے اُمڈتے ہوئے خطرے نے اب نئی نسل کی فکر و نظر میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے - سیاسی فشار ، معاشی کساد بازاری اور انسانی اقدار کی بے حرمتی نے نوجوان نسل کو ایک خلا میں پہنچا دیا ہے - "یقین محکم ، عمل پیہم" اس نسل کے لیے اب صرف "ڈیبیٹ" کی چیز رہ گئی ہے - ناصح مشفق کا رول ادا کرنے والی شاعری سے یوں بھی اردو شاعری مدتوں سے بدگمان ہوتی چلی آئی ہے — مگر اس دور میں یہ بدگمانی بڑھ کر بےزاری میں بدل گئی ہے :

آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا ؟

دیکھنا یہ ہے کہ آج کا وہ قاری جو نئی نسل سے منسوب ہے اقبال کے کلام کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے - اقبالیات کا وہ سلسلہ جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا اس نسل کو اپنی طرف متوجہ کر پایا ہے ؟ اس کا جواب علامہ کے کلام کے تمام مفسرین کو دیانت کے ساتھ دینا چاہیے - کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مفسرین کی نگارشات کا ہدف باہر کے ملکوں کے "صاحبانِ بصیرت" ہیں اور وہ اپنے ملک کے نوجوانوں کے ذہنی اور جذباتی مسائل سے بے خبر ہیں -

بات ایک بہت بڑے ذہنی انقلاب کی ہے جو اس دور میں واقع ہوا ہوا ہے - تاریخ نے نئی نسل کو جہاں ڈال دیا ہے وہاں وہ میر اور غالب سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے وہ بجا طور پر ''تاریخ'' سے کہہ سکتے ہیں :

خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں
یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

اس نسل کی آواز غالب کی آواز سے مل جاتی ہے :

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

بہرحال اقبال اور نئی نسل کے بارے میں ابھی حتمی رائے کوئی نہیں دی جا سکتی - اتنی بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اقبال کے کلام میں اس ذہنی انقلاب سے خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے اور وہ ''چیز'' موجود ہے جو اس انقلاب کو مثبت رخ دے سکتی ہے :

شاخِ نہال سدرہ ، خار و خس چمن مشو
منکرِ او اگر شدی ، منکر خویشتن مشو

آخر میں ایک اور قاری سے ہمیں سابقہ پڑتا ہے جس سے اقبال کا رشتہ بہت محکم اور بڑی محبت کا ہے اور یہ قاری بھی اقبال سے بہت مانوس ہے - یہ دنیا کا سب سے بڑا فلسفی ہے - اس کی آنکھوں میں تحیر ہے اور اس کے ہونٹوں پر زندگی نو شگفتہ کلی کی طرح ہے - علم و ادب جاہ و منصب کا سارا طنطنہ ، سارا دبدبہ ، سارا غرور اس کے سامنے دھرا رہ جاتا ہے - یہ وہ ہے جسے اقبال نے ''والدۂ مرحومہ کی یاد میں'' ''طفل سادہ'' کہا ہے - اسی ''طفل سادہ'' کی بنا پر اقبال کے کلام میں ''جگنو'' چمکتے ہیں اور ''گلہری'' بولتی ہے - اقبال کے کلام میں یہ ''طفل سادہ'' دعا بن جاتا ہے :

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

یہ دعا روشنی ہے ، زندگی ہے ، آزادی ہے :

آزاد مجھ کو کر دے اے قید کرنے والے

آج آزادی کی یہ دعا دنیا بھر کے اُن لوگوں کی دعا ہے ۔ جو مختلف قسم
کی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں ۔'

URDU RESEARCH CENTRE ★ V.K. HYD.
A.C.C. No. 96

۱ - سیر آب ، کوئٹہ ، اگست ۱۹۸۷ء ، ص ۱۲۲ تا ۱۲۸ ۔